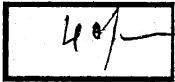


چاہو اے اہم

اقبالِ متین

نصرتِ پیشرو - وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ ۳۴

”فجئت“:



اِفْتِسَابُ

میرے بابا مرعوم کے نام

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نصرت پبلشرز۔ وکٹوریہ اسٹریٹ۔ لکھنؤ۔

کتابت:۔ وقار رضوی
مطبع:۔ نظامی پریس
بار اول:۔ چھ سو
جون ۱۹۷۲

فہرست

ایک پھول ایک تتلی

۹

پچھلا دروازہ

۱۸

شعورِ سفر منزل

۲۰

پانی کے چراغ

۴۹

ساحی

۸۱

تین مسافر

۱۰۵

کینڈل کا لونی

۱۱۴

اندھیروں کی لاج

۱۳۱

کتاب سے کتبہ تک

۱۵۷

شکن در شکن

۱۸۴

پچور

۲۰۳

نچا ہوا البم

۲۱۷

بہادر

۲۳۰

ایک سوال

۲۳۷

سنگ آستان

۲۴۴

ایک بھول، ایک تیشی

بجھر زمین پر پھوڑا پڑے یا بوسلا دھار بارش ہو، جب کو نیل ہی نہیں بچوٹے
 ئی تو پھر کلی کا چٹکنا معلوم رضینہ چچی بس ایسی ہی ایک بھر سی زمین تھیں۔
 سوکھی سا کھی دھرتی کی طرح چچا کے قدموں کے تلے بھی رہتیں۔ کٹے ہوئے
 نصیحت کے سوکھے تھنہ بھی ہوتے تو کوئی دیکھ سمجھ کر قدم رکھتا کہ مبادا اپنا پیر نہ جھٹی
 ہو جائے یا پھر زندگی کی رسمساہٹ ہی رہے۔ نشتے نشتے ہرے ہرے پودے
 رادل کی طرح سینہ تانے کھڑے ہوں تو پھر زندگی کو کچل دینا کوئی آسان کام
 میں ہوتا۔ اس لیے اگلے والے قدم خود ہی پیچھے ہٹ سکتے تھے۔ لیکن رضینہ چچی تو
 سسکھا سا کھا جنگل تھیں۔ چوب خشک صحرا تھیں۔ قافلہ آگ ہی لگاتا تھا نہ
 دانہ ہی ہوتا تھا۔

مخردمیاں نیکی کا روپ دھار لیتی ہیں تو نیکیاں قابلِ رحم حد تک مجبوریوں کا
پر تو معلوم ہوتی ہیں اور جب یہی مخردمیاں گناہ بن کر چھاتی ہیں تو بیچاری نیکی کو سر
چھپانے کو اس سر تک نہیں رہتا۔

رضیہ چچی کی مخردمیاں بس نیکی بن کر رہ گئی تھیں۔ اسی نیکی جو خود نیکی سے
خون کھلتے اور خاندان سارا اس نیکی پر مر رہا تھا۔

خدمت، خدمت، خدمت۔ اپنے سے چھوٹوں کی خدمت کر رہی
ہیں برابر دادوں کی خدمت کر رہی ہیں۔ بزرگ تو بزرگ ہی ٹھہرے۔ نہ تائش
کی پروا نہ صلے کی طلب۔ نیکی تقسیم ہو رہی تھی۔ اب جس کے دامن میں بھتی گنجائش
دے سمیٹے، جس کی بھولی جلتی وسیع ہو بھرے اور چچا میاں نے سب سے
زیادہ سمیٹا، سب سے زیادہ بھر لیا۔

رضیہ چچی کو چچا میاں کی بھولی بھر کر بڑی خوشی بھی تو ہوتی تھی۔ بڑا آندر
بھی تو لتا تھا۔ لیکن بقدر محبت ہر ایک نے رضیہ چچی سے کچھ نہ کچھ لیا اور وہ
بھی کس طرح۔ خود انھیں کچھ دینے کے بہانے۔

اور رضیہ چچی دنیا بھر کا دکھ درد سینے میں پھپھائے بس نیکی بن رہیں۔
اور دنیا کے ٹھاٹھیں مار تے بیکران سمت زر کی موجوں پر بس ڈولتی
رہیں۔ غرق ہونے کا ڈر نہیں یا رات رات کی فکر نہیں۔

”رضو چچی، دو روز ہمارے گھر چلیے نا“ بس صبح سے شام تک کچھ
نہ کچھ کہے جاتی ہیں کبھی کبھی کوئی تیریلی تو ہوتی ہی چاہیے زندگی میں۔
اس طرح تو زندگی بجائے خود ایک ”مرد مرہ“ بن جائے گی۔

”اور پھر تمھارے چچا کو جو تکلیف ہو گی۔“

بس لاکھ سوالوں کا ایک جواب رضوی چچی کے پاس کاٹنے کی گولی کی طرح
ڈھلا ڈھلا یا تیار رہتا۔ وہ جس سمت میں چاہتیں ٹھٹ سے اس گولی کو
لڑھکا دیتیں۔

”رضیہ — میری ابھی سی رضوی بی بی — پانچویں کو مانجے ہیں۔ ساتویں
کو ہندی، آٹھویں کو ساہتی اور نویں کو جلوہ۔ دسویں کو پوٹھی ہو گی۔
گیارہویں کو سورج کی کرنیں اپنے ہی گھر کی چھار دیواری میں اسی طرح
محفوظ پاؤ گی جس طرح کچ بھوڑ جاؤ گی۔ جلو بھی اب۔
نواں گھر نویں کو جلوے کی کیا سوچھی بھلا۔

اماں بی کو یہ یاد ہی نہ رہا کہ وہ جو الٹی سیدھی تاریخیں بتلا رہی ہیں ان
میں جلوہ نویں کو آدھکے گا۔ شادی لٹی ابھی دور — وہ چلی گھٹیں رضیہ
چچی کو بھل دینے — کسی نہ کسی طرح انھیں بہر حال اپنے گھر لے آنا تھا۔
وہ آجائیں تو جیسے سارے گھر کی آسائشیں آجائیں۔ دلوں کو اطمینان
اور سکون حاصل ہو جاتا۔ سینے خوشیوں سے منور ہو جاتے، قلب گرم
ہو جاتے۔

چہرہ دیکھو تو ازل کی پیار معلوم ہوں لیکن اس ڈھنگ سے اس ڈھب
سے ہنسی کا نقاب سارے چہرے پر ڈال رکھتیں کہ اندر کے کرب تک کسی
کی کیا مجال جو پہونچ جائے۔

قریب میں جاتیں، دکھ ہماری میں جاتیں، جہاں اور جس وقت

جاتیں اس طرح جاتیں جیسے خوشی سب کی ہو تو سب کی نہ ہوئی کس کھنس
کی ہوئی۔ غم سب کا ہو تو سب کا نہ ہو اس کھنس کا ہوا۔

ایک دن آدھ جھگڑا ہوتی۔ پھر سب کے سب یہ بچوں بھاگ جاتے کہ
بڑے چاچا اور لکڑی سے بڑی محبت اور پیار سے انھیں لے آئے تھے کہ کچھ
خاطر کریں، کچھ مدارات ہو۔

لیکن رشتہ پیچھے نے دیر و حرم کی ساری نیکیاں پیو میں باند رکھی تھیں۔
اب وہ آجیتہ سے بلو کی گرہ کھولتیں اور اچالے سے بکھر جاتے۔ یہ اچالے
سارے کے سارے ان کی ذات کے لیے بالکل نہیں تھے۔ وہ تو بس
آنکھ بند کیے موتیوں کی طرح نیکیاں بکھیرتی تھیں۔ اچالے کر دینے
والوں نے انھیں صرف اندھیرے دیے۔ لیکن انکے چہرے کی ہنسی نہ گئی۔ سو نہ گئی۔
مضجھل سے چہرے پر دکھتی ہوئی ہڈیوں پر، جھکی ہوئی کمر پر انھوں
نے کبھی غم کی پرچھائیں پڑنے دی، نہ محنت پر تھکن محسوس کی نہ خاندان
بکھر کا بوجھ اٹھالینے سے گریز کیا۔

صبح اٹھتیں، الٹی سیدھی پان کی گلواری منہ میں کھولتیں۔ کمر اس
طرح سی بھی کرتیں جیسے آنکھیں میچ کر طاقت کے انکشاف کو ادھی ہوں اور
کام میں جھٹ جاتیں۔ پھر سارے گھر والے ہمان بن کر بیٹھ رہتے۔ رشتہ
پچھی میزبان بنیں ہر ایک کا خیال دکھتی پھرتیں۔ ”اجو نے کھانا نہیں کھلایا۔
ایو نے چائے نہیں پی۔“ میاں کے لیے پانی تو گرم کر دیا ہوتا ہوا، وہ
اب اٹھتے ہی ہوں گے۔ یہ باندیاں آنکھ میں اس طرح کیوں پھیلا رکھی

ہیں۔ الگنی پر یہ ڈھیر سے کپڑے یوں نہیں رکھ سچوڑتے۔ لاؤ میں سمیٹ لوں یہ

”ماما جی سن رہی ہو۔“ لیکن ماما جی کان میں تیں ڈالے بیٹھ رہتیں۔ اور رخصتی چچی خود ہی سودے سلف کا حساب جوڑنے میں مانتا چکی کرتی رہتیں۔

بچے باپے تنگ کرتے سوا لگ۔ مانتیں اڑن کھانیاں بتاتیں۔ اور یہ سب کو بٹھاتی پھرتیں۔ رستے پہلے جائتیں اور سبک بعد سوتیں۔ سا بچو بھٹی اچالے لکھیرنا اور رات گئے اندھیر سے سٹینا۔

منوں بھاری مشین کا ایک پرزہ بھی ڈھیلہ ہو جاتا تو ساری مشین ٹھپ ہو کر رہ جاتی لیکن رخصتی چچی ایسی مشین تھیں کہ کل پرزہ جھڑتے رہیں۔ چوٹی چول ہل کر رہ جائے اور بھر بھر ڈھیلہ ہو جائے۔ لیکن کسی کو کچھ خبر ہی نہ ہوتی اور کام برابر چلنا رہتا۔

بے قیل کا پورا غ تھیں سبے نوم کی بالی۔ لیکن جلیں بڑے ڈھڑتے سے بڑھے ٹھکے سے۔

آدمی اگر اپنے آپ کو اس طرح سچ دے تو شاید دیکھنے والوں کا احسا بے طرح مٹ جاتا ہے۔ رخصتی چچی کو سبھوں نے اپنا لیا تھا اور رخصتی چچی سبھوں کے کام کو اپنا لیا تھا۔ اس طرح یہ ایک دوسرے کو پیار سے تھے۔ اب کون کس کو زیادہ پیارا ہوا۔ یہ آپ طے کیجئے۔

رخصتی چچی کو بھر زمین کہنا زیادتی ہی نہیں ان کی توین بھی ہے۔ اسی غور

جو خاندان بھر کے لیے صرف ابو رحمت نہیں، بارانِ رحمت بھی ہو۔ ایسی عورت جس کے مزاج کے کھنڈے سائے نے اور مضحک چہرے کی نرم دھوپ نے خاندان بھر کی کھیتی ہری کر دی اس کی کوکھ سے غمی نہ پھیلے تو کیا، کوئیل نہ پھوٹے تو کیا۔

لیکن یہ دکھ درد خاندان بھر کا تو نہ تھا۔ رضیہ بیچی کا اپنا دکھ تھا۔ رضیہ بیچی کا اپنا درد۔ رضیہ بیچی کی اپنی خوشی کبھی کسی نے دیکھی نہیں۔ رضیہ بیچی کا اپنا دکھ درد کسی نے بانٹ نہیں لیا۔

اسی لیے تو انھیں بجز زمین کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں معلوم ہوتا۔ دودھ حل کھڑے دونوں ہی ساقط ہو گئے۔ رضیہ بیچی پھوٹ پھوٹ کر روئیں۔ بنگ بنگ کر تڑپیں لیکن مولا کی مرضی میں کون دخیل ہو سکتا ہے بھلا۔

”بہتہ نہیں میں کون گناہوں کا خمیازہ بھگت رہی ہوں“

کبھی رضیہ بیچی نے ایسی بات کی بھی تو کچھ اس انداز سے کی جیسے اپنے گناہ انھیں معلوم ہیں۔ اور پھر انھوں نے کبھی ایسی بات کی ہی نہیں۔

کوئیلیں ایک نہیں دوبار پھوٹی تھیں۔ تنھے تنھے پردوں کا روپ دھانے سے پہلے سب کچھ خشک ہو گیا۔ اور اس طرح ہوا کہ ساری دھرتی بجز ہو کر رہ گئی۔

اب ان کی زندگی میں کوئی اچالے کی کرن تھی تو بس یہی کہ وہ خاندان بھر کی پیار ہی تھیں۔ چاہے جانے اور پسند کیے جانے کی خواہش آدمی کی فطرت ہے۔ پھر ایسے میں جب کہ اپنا کچھ بھی نہ رہے تو یہی دوسروں کی دی ہوئی رنجیتیں

زندگی کے دکھ درد کو مسکرا کر سہن کرنے میں بڑی مدد کرتی ہیں اور اس طرح رضیہ بچی کی محرومیاں نیکی بن بیٹھی تھیں۔

بچا میاں تو ان کے دکھوائے تھے ہی۔ اس سے بھلا کس کو انکار ہو سکتا تھا۔ لیکن رضیہ بچی نے بچا میاں کو نہ صرف اپنی محبت دی۔ اپنا ایمان دیا، اپنی زندگی دی۔ موادِ صفی میں ان کی محبت تک نہیں مانگی۔ کچھ مانگا بھی تو وہ صرف بچا میاں کی خوش فودی تھی۔ اور بس۔

بچا میاں خوش ہو جاتے تو رضیہ بچی کے حصے میں جیسے سارے جہاں کی نعمتیں سمٹ آتیں۔ وہ کسی معمولی سی بات پر بھی برا مان جاتے تو جیستی، جاگتی زندگی ہی میں جیسے انکی سانسیں ان سے الگ ہو جاتیں۔

اور پھر بڑی بچی کی ہٹ دھرمیوں کو رضیہ بچی نے ہمیشہ یہ جان کر سہہ لیا جیسے ہر حق بڑی بچی ہی کا حق ہو۔ ان کا اپنا تو جیسے کچھ تھا ہی نہیں اور اگر کچھ تھا بھی تو اس طرح کہ بچا میاں کی خوشی ان کا سب کچھ، بڑی بچی کی خوشی ان کا سب کچھ، یہاں تک کہ بڑی بچی کے بطن سے بچا میاں کی جو اولاد تھی ان کی خوشی بھی ان کا سب کچھ تھی۔

بس رضیہ بچی کو یوں سمجھے جیسے نیم کا بہت بڑا اور کھنا پیٹر ہوں۔ ننھی سنی فاختائیں اس پیٹر کی شاخ پر آ بیٹھتیں تب بھی یہ پیٹر اپنے ٹھنڈے ٹھنڈے سایوں کی شانتی دے گا۔

موٹے تانے گدھ اس پیٹر کی شاخ پر آ بیٹھیں تب بھی یہ پیٹر اپنے ٹھنڈے ٹھنڈے سایوں کی شانتی دے گا۔

نہ اچھوں کی توصیف، نہ بدوں کی تحقیر۔

اب جب کسی کا سب ہی کچھ دوسروں کی خوشی ہو تو وہ خود سے رہ ہی
کہاں جاتا ہے۔ اس لئے سچ بول چھٹے تو اب ارضیہ چچی خود سے کچھ چھٹیں
ہی نہیں۔

ایک دن بڑی چچی کسی بات پر برہم چھٹیں۔ چچا میاں کے تیرہ لکے پکڑے
دکھائی نہ دیتے تھے۔ ٹھنڈی جنگ یکایک بموں کے دھماکوں میں بدل
گئی تو راضیہ چچی امن کا پیام لے کر دونوں کے درمیان کود پڑیں۔
یہ ان کی زندگی کا پہلا اور آخری وقت تھا جو بڑی چچی اور چچا میاں
کے بھیلے ہوئے اندھیرے کو اچھوٹا سا دیا لے وہ رکنے پہلی تھیں۔
بڑی چچی کے پیچھے ایک دنیا تھی۔ باں بچے، ارمان، قانون سب ہی کچھ
مضاحکت کرانے والا یہ تو نہیں دیکھتا کہ لڑتے ہوئے ہاتھوں کی قوت دس
میں بھی ہے۔ وہ تو صرف اس سچائی کے بل بوتے پر آگے بڑھتا ہے جس کا
نام محبت ہے، جس کا نام اجالا ہے، جس کا نام نیکی ہے۔

اور اگر کوئی اس محبت ہی کے منہ پر ہتھوک دے تو۔

زور اگر کوئی اس اجالے ہی کے منہ پر ہتھوک دے تو۔

اور اگر کوئی اس نیکی ہی کے منہ پر ہتھوک دے تو۔

اور بڑی چچی نے ہی کیا۔ کہنے لگیں۔ اپنے کو بیچا تو رضیہ بی

عقد، نہ نکاح۔ دعوے برابر ہی کے ہیں۔ دو ہاتھ ٹکرائیں تو درمیان
آنے والی چیز نئی، نہ دنیا کی رہے گی نہ دین کی۔ رضیہ چچی نے ادم

اُدھر آنکھیں کھما کر خاندان بھر کو اس طرح دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں۔
 مجھے بلند یوں تک لے پلوا مجھے ادب اٹھا لو۔ دنیا تو میں نے اپنی محبت
 سے جیت لی ہے۔ میرا دین کہیں سے ڈھونڈ لاؤ۔ میں نے اپنے
 بچوں کو اس دنیا میں آنے سے قبل ہی اس لیے ختم کر دیا کہ انہیں بھی ان کا دین
 نہیں ملے گا۔ ان کا خدا نہیں ملے گا۔

اب رضیہ بیچی کو کون سمجھائے کہ جس سے ساری خدائی محبت کہ
 وہ اس سے بہت بڑا ہوتا ہے جس سے صرف خدا محبت کرتا ہے۔
 اور رضیہ بیچی اسی کوئی بات سمجھیں گی بھی تو نہیں اس لیے کہ وہ تو بھلی
 ہوئی کسی ایک بیٹی بن کر رہ گئی ہیں۔ ایک ایسا روپ بن کر رہ گئی ہیں
 جو اپنا حق بھیک کی طرح مانگتا ہے۔

ایک پھول۔ ایک تتلی

پھول تو اپنی خوشبو دے دے۔

پھول تو اپنا رنگ روپ تج دے۔

نہ کانٹا بن کر بھینا آئے۔ نہ ڈنک بن کر نشر لگانا۔

پچھلا دروازہ

”نیمنی، نیمنی“

لیکن وہ جاگتی کے ساتھ جا چکی تھی۔

میں نے اس کو تلاش کرنا مناسب نہ سمجھا۔ میں نے تیسری بار جب اس کو ٹیگ (Tag) کیا تھا تو صرف اس سے وعدہ لینے کے لیے کہ وہ انٹرول میں مجھ سے ملے گی۔ ویسے میں اس کو کئی بار ٹیگ کر سکتا تھا۔ آدھ کسٹرانے ابھی ابھی اپنی دھن تبدیل کی تھی اور میرے لیے پھر موقع تھا۔ اسکے ہیکلیٹوں کی تعداد دیکھتے کے دیکھتے بڑھ رہی تھی اور یہ اس کی مقبولیت کی دلیل تھی لیکن تیسری بار جب میں نے ٹیگ کیا تھا تو جاگی نے بڑی خشونت سے مجھ دیکھا تھا شاید اس لیے کہ وہ تیسرا اسٹپ لے رہا تھا کہ میں نے آدھ کسٹرانے پر دیکھے بغیر پھر ٹیگ

کر دیا۔ یہ بات ایک صاحبک غیر اخلاقی تھے۔

اُسی وقت میں نے نینسی سے وعدہ لیا کہ وہ انٹرول میں مجھ سے ملے گی۔ وہ ابھی پوری طرح وعدہ بھی نہ کر سکی تھی کہ کسی نے مجھے ٹیگ کیا اور میں بادل ناخواستہ ہٹ آیا۔

مجھے حیرت ہوئی کہ وہ جا کی نہ تھا۔

آرکسٹر اپنے پورے شباب پر تھا، اور مجھے کچھ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ قص کی رفتار آرکسٹر اسے بھی تیز ہے۔ اس لیے کہ وہ لوگ جو قص کر رہے تھے انھیں زندگی اپنا حسن، اپنی خوبصورتی، اپنا دس، اپنی حرارت سب کچھ تقسیم کر رہی تھی۔ آرکسٹر بجانے والوں کے حصے میں جیسے اس حسن، اس خوبصورتی، اس رمل اور اس حرارت سے کچھ بھی نہ آیا تھا۔ وہ صرف اپنا فریضہ پورا کر رہے تھے۔ بالکل اس طرح جیسے میں آفس میں فائلیس ڈیل کرتا ہوں۔

زندگی کا یہ تضاد دیدنی تھا۔

جا کی سفید اسکرٹ پہنی ہوئی ایک حسینہ کے ساتھ ناچ رہا تھا جو نینسی جیسے کم خوبصورت نہیں تھی۔

جس تان سر اور کئے پر ہم تھرک رہے تھے، لپٹ رہے تھے چوم رہے تھے۔

جن لہروں پر ہم رقصاں تھے۔

ان لہروں کے سونے کسی ایسی کیفیت سے پھوٹ رہے تھے جیسے دلی کہا جاسکتا ہے۔ جسے ادا سہی کہا جاسکتا ہے۔ جسے محرومی کہا جاسکتا ہے۔

لیکن رقص زندگی سے بہت قریب تھا۔ اتنا قریب کہ اس میں اور زندگی نہیں
کوئی فرق نہیں رہ گیا تھا۔

زندگی کا یہ تعداد میں پھر انہوں کا کاش آپ دیکھ پاتے۔
اور اب جب کہ میں نینسی منی پکار رہا تھا۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ اس مرد
ہو چکا تھا۔ وہی وقفہ جس میں نینسی نے مجھ سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔
لیکن وہ مجھ سے ملی نہیں۔

وہ برسیں سے باہر نہیں جاسکتے تھے۔ ویسے وہ چاہتے تو دنیا جہاں
کو رو نہ کر رکھ دیتے۔ اس لیے کہ ان کے سینے میں جو دل و دماغ رہتے
تھے ان کی آواز مجھے معلوم تھا ایک ہو گئی تھی۔ بالکل ایک۔ لیکن اس
وقت کہیں جانے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔

اب جو رقص شروع ہوتے والا تھا وہ بطور خاص نئے سال کو خوش آمدید
کہنے کے لیے تھا۔ رات کے بارہ بجکر ایک سکندر پریم نئے سال کو اپنے گن بھول
پراٹھا کرنا چھنے دے تھے۔ جانے دے سال کو دعا دے دعا دے دے
تھے لیکن جانے والا سال جیسے اس گہما گہمی سے اس رقص سے آنکھیں چپا کر
اور دامن بچا کر گھر جانا چاہتا تھا۔ اس لیے کہ اس کے ہونٹوں کی پٹاٹک
اڑ گئی تھی۔ اس کے چہرے کا غاڑہ سفید سفید دھبے بن کر ابھر آیا تھا۔ اس کے
اعضاء کا تناؤ ختم ہو گیا تھا۔ اس کے جسم کی پکار چپ ہو گئی تھی اور اب اس کا
دل کھڑ جانے والا تھا۔

یہ حساب تو بعد میں ہوتا رہے گا کہ ہم نے اس سال سے کیا کیا، اور

اس سال کو کیا دیا۔ کتنے تو ایسے ہوں گے جو یہ سوچتے بھی نہ ہوں گے کہ ہمیں اس طرح بھی حساب کتاب کرنا چاہیئے۔ اور کیوں سوچیں۔ زندگی بہر حال گزراں ہے، قصاں ہے۔

مجھے کیر و زردہ کی میں اپنا پھرہ صداقت نظر آ رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ تل بھی نظر آ رہا تھا جو میرے بائیں کال کے اوپر ہی تھے پر تھا اور جو نینسی کو بہت پسند تھا اور جس کو اس نے کئی بار چوما تھا۔

میں بہت کچھ سوچ رہا تھا۔
لیکن کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں کچھ بھی نہیں سوچ رہا ہوں۔

شاید یہ سب دہکی کا کرشمہ تھا۔

ڈانس شروع ہوتے ہیں ابھی کچھ دیر بھتی۔

مجھے شدید تنہائی کا احساس ہو رہا تھا۔ حالانکہ یہاں کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ میں جتنی چاہیئے پی سکتا تھا۔ جس عورت سے چاہئے شریفانہ بات چیت کر سکتا تھا۔ اس کو پیسنے کا آذر کر سکتا تھا۔ پھر کتنی ہی ایسی باتیں جن کے ہونٹوں کی سرخی، میں دہکی کے صرف ایک گھونٹ کے بدلے میں جوا لے سکتا تھا۔ لیکن یہ تنہائی مجھے یہ کہیں سلط ہو رہی تھی؟

وہ کون سی شے تھی جو پچھلے چپکے سے آگے بڑھ کر میرے دل کے بازار میں بے ہودے سامان کا سودا کر رہی تھی۔ اور سب بچھ اس بے دردی سے اٹھا رہی تھی جیسے یہ بازار اب بھائیں بھائیں کرنے لگے گا۔

مجھے نینسی نے اس کو دیا تھا۔ میں اس حقیقت کو جھٹلانے کی کوشش کرتا

وہ شے نینسی ہی تھی جو میرے دل کے بازار میں بیچے ہوئے سامان کا سودا کر رہی تھی۔
مجھے ادا اس ہونا نہیں چاہیے تھا۔ ویسے میں نینسی کے ساتھ بھی تو نہیں آیا
تھا۔ اس کی ماں نے تو مجھ سے کہا تھا کہ وہ نیوا یر سمبی میں منار ہی ہے۔

میں نے جھٹ سفید اسکرٹ پہنی ہوئی حسینہ کا ہاتھ تھام لیا جو میرے
برابر سے گزر رہی تھی جس کو میں جاکنی کے ساتھ ناچتا ہوا دیکھ چکا تھا اور جو
نینسی سے کم خوبصورت نہیں تھی۔

اس کے پیچھے سفید سوٹ پر کالی بونگایا ہوا ایک نوجوان بھی تھا جو شاید
اس سے پیگ بڑھانے کی فکر میں تھا۔

”اد“۔ اس نے ”اد“ اس انداز سے کہا جیسے میرے ہاتھ تھام لینے
پر خوشی سے چیخ اٹھی ہو۔

میں نے بڑی بے تکلفی سے اس کو اپنے پاس بٹھالیا۔ اس نے بھی اپنی کرسی
قریب کر لی۔

پہلے یہ بتاؤ کیا بیوگی؟

نوجوان مجھے ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے میں کسی ایسی سگریٹ کا دھواں
ہوں جو مسلسل اس کی آنکھوں میں گھس رہا ہے۔

”تم کیا پانی رہتے ہو؟“ اس نے پوچھا۔
”کیر و ز دہسکی“

”تو پھر کیر و ز جن بیوں گی؟“
میں نے ہیرا کو آواز دی

مجھے نینسی کا خیال آیا۔

میں نے بہت احتیاط سے سفید اسکرٹ پہنی ہوئی حسینہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ

میں لے کر بڑی نرمی سے چوم لیا۔

مجھے نینسی کا پھر خیال آیا۔ جیسے وہ میرے تل کو چوم رہی ہو۔

میں نے اپنے گلاس کو ایک ہی گلب میں خالی کر دیا۔

میں نے پھر میرے کو آواز دی۔

جب وہ سب کچھ رکھ گیا تو ہم نے جام ٹکرائے اور سب کیا پھر میں نے
کانٹے سے اٹھا کر ٹھیلی کا قتلہ اپنے ہاتھ سے اپنے ساتھی کو کھلایا۔

ہاں میں یہ کہنا ہی بھول گیا کہ جب جام ٹکرائے گئے تو ہم نے (HAPPY
(NEW YEAR کے نام منسوب کیا۔ جیسے ہم دونوں پریسز ڈانس روم کے ساتھی
نہ ہوں بلکہ گلاس قیلوز ہوں جو ایک ہی سبق رٹ کر آئے ہوں۔ ورنہ ہر نیا
سال اپنے جھلو میں صرف خوشیاں ہی لے کر تو نہیں آتا ہے۔ میں نے۔
سوچا ہم نئے سال کے نئے غموں کے نام بھی تو جام بخور کر سکتے تھے۔

رنگوں کی بہتات ہی رنگوں کا حسین امتزاج بن گئی تھی۔ وہ ٹیل جن
ہم بیٹھے ہوئے تھے بار کے پورشن سے متصل ایک گوشے میں تھا۔ سارا ڈانس روم
اور اس کے اطراف کا کھلا ہوا حصہ جس میں بے شمار میزیں اور کرسیاں تھیں
اور جن پر بے شمار دل دھڑک رہے تھے، دور دور تک ہماری نظروں کی
پہنچ میں تھا۔

یہاں بھی صرف قہقہے نہیں تھے۔

کچھ ٹھٹکی ٹھٹکی نظریں بھی مجھ سے ملیں۔
 کچھ دبی دبی سسکیاں بھی میرے ہاتھ لگیں۔
 کچھ ڈھکے ڈھکے آنسو بھی میرے دامن دل کو بھگو گئے۔
 کچھ چھپی چھپی آنکھیں بھی میرے سینے میں در آئیں۔

ہمارے میز کے مقابل کچھ ہی فاصلے پر ہماری ساری میں ملبوس ایک عورت
 کچھ اس اداسے آنسو کریم کھا رہی تھی جیسے آنسو کریم بہت گرم ہو، اور اس کو
 گلنڈا کرنے کے لیے تھوڑا سا دقت اسے چاہیے۔

اس عورت کی عمر۔۔۔ لیکن میں عمر کس طرح بتا سکتا ہوں۔ اس لیے کہ عورت
 کی کوئی عمر ہی نہیں ہوتی۔ یوں سمجھئے کہ کچھ بچگی کی اس منزل پر تھی جیسے درخت پر
 لگا ہوا ایک ایسا پھل ہو جو ہوا کے ایک جھلکے سے تھوڑے سے اپنی شاخ سے
 الگ ہو سکتا ہو۔۔۔ اس کی جوانی اور آنے والی عمر جسے میں بڑھایا نہیں کہہ
 سکتا کچھ سہمے سہمے بڑی احتیاط سے آپس میں گلے ملتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔
 لیکن وہ کسی زمانے میں بہت سوں سے بڑھ چڑھ کر رہی ہو گئی کیوں کہ وہ اب بھی
 بہت سوں سے بڑھ چڑھ کر تھی۔ لیکن اس کی آنکھوں میں بلا کا حزن تھا۔ ایسا
 حزن جو ٹھہر کر، ختم کر لیں انتظار ہی انتظار بن گیا ہو۔

میرے اسے بار بار بڑی خور سے دیکھا تھا۔ اس دقت بھی جب وہ
 تاج رہی تھی اس کی آنکھیں کسی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔

اب جب کہ وہ آنسو کریم کھا رہی تھی اس وقت بھی وہ کسی کو ڈھونڈ رہی
 تھی۔ ویسے اپنی میز پر وہ تنہا نہ تھی۔ ایک اور عورت اس کے برابر بیٹھی ہوئی تھی۔

ایک مرد اس کے مقابل تھا۔ جو اس کو طرح طرح سے بھڑا رہا تھا۔

سیری ساکتی نے مجھ سے پوچھا۔

”کس کے انتظار میں ہو؟“

میں نے نفی میں اس طرح جواب دیا جیسے مجھے منتہی کا انتظار نہیں ہو۔

”ڈارلنگ۔“ میں نے اس سے معافی چاہی اور اس کی طرف متوجہ ہو گیا اور اس کا نرم ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا لیکن اسے چوما نہیں حالانکہ

وہ سو بار چومنے کی شے تھی۔

”تام کیا ہے تمہارا؟“

”پولن“

”کیا کرتی ہو؟“

”اسٹوڈنٹسٹ ہوں“

”کہاں۔۔۔ کسی گورنمنٹ آفس میں؟“

”ہاں۔۔“

”پھر اپنے ساتھیوں سے اپنا اتنا بہت سارا حسن کس طرح بچا لیتی ہو؟“

”ساتھیوں سے اپنا حسن میں نہیں بچاتی۔ اس دفتر کا سب سے بڑا عہدیدار

یہ فرض پورا کرتا ہے“

”کس طرح بھلا؟“

”میں اس کی پیشی کی اسٹوڈنٹ ہوں۔“ وہ کچھ رک کر پھر کہنے لگی۔۔۔

”دفتر کے سارے ساتھی مجھے صحن حسرت سے دیکھ لیتے پر ہی اکتفا کرتے

ہیں۔ مجھ سے بات کرنے کی بھی ان میں ہمت نہیں ہوتی۔
 ”اور اگر کوئی مجھ جیسا بے گلا بات کرے تو“
 ”تو میں اسے“ لفٹ“ نہیں دیتی۔

”ایک آدھ ایسا بھی ہو گا جو تھیں لفٹ نہیں دیتا ہو گا لیکن تمھاری
 نظریں اس تک نہیں پہنچتی ہوں گی۔“

”ہو گا کوئی۔۔۔ یا اگر میرے آفس میں تم ہوتے تو شاید وہیں ہوتے۔“
 ”میں اس طنز کو سمجھ رہا تھا۔“

”یہاں اب مجھے کھل کر مسکرانے کی ضرورت تھی بلکہ اسے چومنے کی بھی۔“
 لیکن میں صرف مسکرا سکا۔۔۔ جو م نہ سکا۔

”میں ہوتا تو تمھارے پاس کے سامنے بیٹھ کر بے اندازہ محبت کی باتیں
 کرتا۔“ میں اس سے آدھ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن ایک دم اکٹھ کھڑا ہوا جیسے
 بجلی کا کرنٹ چھو گیا ہو۔

شاید منشی داپس آگئی تھی۔

۔۔۔ میں نے بہت تلاش کیا۔ میری نظریں گوشے گوشے میں کھٹکتی رہیں۔

لیکن وہ منشی نہیں تھی جس کو میں منشی سمجھ بیٹھا تھا۔

”کیا دیکھ رہے ہو؟“

”ایک دوست کو۔“

”گرل فرینڈ ہو گی کوئی؟“

”اگر میں ہاں کہہ دوں تو تم جل جاؤ گی۔“

اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ کہنے لگی۔

”یہاں عورتیں عورتوں کی دوست بن جاتی ہیں اور مرد مرد کے قریب“

”کافی سمجھ دار رہو۔ مجھے بچہ ملنا پڑے گا تم سے۔۔۔ بلو گی؟“

”ہاں۔“ اس نے وعدہ کی قطعیت کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

اور جب وعدہ ہو چکا تو آرکسٹر انشروع ہو چکا تھا۔

اس نے مجھے کھیچا۔

میں اب ڈانس کرنے کے موڈ میں بالکل نہیں تھا۔ لیکن کوئی چارہ نہ تھا۔

اس کے باوجود میں نے اس کی کمر میں اپنی گرفت کو مضبوط رکھا تاکہ اس کو میری
س بے دلی کا احساس نہ ہو۔

کوئی منٹ بھر بھی نہ گزرا ہو گا کہ کس نے مجھے ٹیگ کیا۔

اور میں فوراً ڈانس روم سے باہر نکل آیا۔ اور دوسری میز پر جا بیٹھا
تاکہ پیرلن کے لیے مجھے دیکھ سکے گا امکان کم ہو جائے۔

آہستہ آہستہ رقص میں رنگ آ رہا تھا۔ گرمی آرہی تھی، زندگی آرہی تھی۔

پھت کے قریب رنگ برنگے سیلون ریش کو چوم رہے تھے اور اس طرح
رنگوں کا ایک رقص ڈانس روم کے فرش سے بلند رہا ہو رہا تھا جو انسان کی پہنچ
سے باہر تھا۔ جو دستی اور رقابت کے جذبات سے ملتا رہا تھا۔

عرش تا فرش رنگوں کا یہ سیلاب موج در موج اٹھ رہا تھا۔

نیا سال اب آنے کو ہی تھا۔

آرکسٹر انے سال کی سواگت کے لیے اپنی لے کو تیز کر رہا تھا۔

ڈانس روم کے فرش پر تیز تیز ہتھرتھرتے ہوئے قدموں کی پراہنگ کھٹکھٹ
آرکسٹر کی نئے سے نئے ملا رہی تھی۔

اور یہیں نئے سال کے قدموں کی آہٹ صاف سنائی دے رہی تھی۔
پولن ایک چینی لڑکے کے ساتھ ناچ رہی تھی۔

ہری ساری والی وہ عورت بڑی گرم جوشی سے کسی کے ساتھ چمپی ہوئی تھی
اور اس کی آنکھوں میں اب وہ جوان دور دور تک نہیں کھتا جو میں کچھ ہی دیر پہلے
اس کی آنکھوں میں دیکھ چکا تھا۔

شاید وہ شخص اٹھ مل گیا تھا جس کی وہ منتظر تھی۔
ایک چھری سی لڑکی ایک چھری سے لڑکے کے ساتھ سب سے زیادہ گرجو
دکھا رہی تھی۔ دونوں ہی معمولی شکل و صورت کے تھے لیکن اس بھرے پورے
ڈانس روم میں وہ سب سے زیادہ مطمئن دکھائی دیتے تھے۔
ایک کھنڈ جو ان ایک مسلم لڑکی کو بڑے چارے سے اپنے بازوؤں میں سمیٹے ہوئے
ناچ رہا تھا۔

یہاں صرف عورت تھی، مرد تھا، یہاں صرف پیار تھا، جذبہ تھا، یہاں رقا
بھی تھی لیکن یہاں مذہب کہیں نہیں تھا۔

پتہ نہیں ان میں سے کتنے اپنے بازو ایک دوسرے کی کمر میں ڈالے۔ اپنے
ہاتھ ایک دوسرے کے ہاتھ میں دیے کسی اور ہی کے متعلق سوچ رہے ہوں جوش
اس ڈانس روم میں ہو ہی نہیں سکتا اگر ہو بھی تو کسی اور ہی کے ساتھ۔ ایک دوسرے
سے اتنا قریب ہو کر بھی ایک دوسرے سے بہت دور۔ یہاں قرب و دوری کا

نئے سال کی آمد کا منتظر تھا۔

— اور میرا دواں دواں ننیشی ننیشی پکار رہا تھا۔

میرے گلاس میں دھکی کا صرف ایک گھونٹ باقی رہ گیا تھا۔

اور میں اپنے چہرے کا تل اس دھکی میں دیکھ سکتا تھا۔

اور اس تل پر ننیشی کے بوسوں کی حدت کو اب تک محسوس کر سکتا تھا۔

ننیشی یہاں نہیں تھی۔ وہ نئے سال کا انتظار کیے بغیر۔ جا کی کے ساتھ
بھی تھی۔

میں جب پرسینر میں داخل ہوا تھا تو زندگی میں کتنا حسن داخل ہوا تھا
تک کس قدر خوبصورت تھا، لمبے کیسا سبز دھج کر میرے آگے سے گزرا ہے

— اور اب دیکھتے ہی دیکھتے مجھے کیا ہو گیا تھا۔ یہاں تو وہی سب کچھ
لیکن ننیشی نے شاید زندگی کو دیکھنے کے سارے زاویے بدل کر رکھ دیے

— باہر کا جگمگاتا ہوا ماحول میرے سینے میں چھپی ہوئی ادا سیوں میں بنا ہوا
رہا تھا۔ خوار حیت غیر محسوس طور پر میری داخلیت میں جذب ہو رہی

— ہری ساری دالی عورت نے جیسے اپنی آنکھوں کا سارا حزن مجھے سونپ
یا تھا۔

ننیشی یوں بہت دنوں سے مجھ سے نہیں مل رہی تھی۔

مجھے معلوم تھا کہ جا کی ان دونوں اپنا سارا پیار اس پر سمجھا دے کر رہا تھا
میں یہ بھی جانتا تھا کہ نینسی اس پیار کو بڑی ہمت سے سمیٹ رہی تھی۔
لیکن میں کبھی اس سے مل لیتا تو وہ مجھے نظر انداز نہ کرتی۔

اس کے باوجود اب میرے لیے نینسی میں کیا تھا۔

ویسے اس کی شخصیت میرے لیے نقص کاہوں، سینما گھر و ف، رستورانوں،
ادریار کوں ہی میں قابلِ توجہ رہی تھی۔

جیب سبک ہوتی تو مجھے کبھی نینسی کا خیال ہی نہ آتا۔

جیب کا بوجھ مجھے اکسانا تو اس بوجھ کو ہلکا کرنے کے لیے نینسی کی مدد کی
مجھے ضرورت پڑتی۔

لیکن آج نینسی مجھے حاصل نہ تھی۔ تو

لیکن آج نینسی مجھ سے چھپی جا رہی تھی۔ تو

میری نہ صرف دلچسپی اس میں بڑھ رہی تھی بلکہ کچھ لوں مخصوص، بیہوش رہا تھا جیسے
نینسی میرے لیے ادھر بھی پکھلتی۔

جیسے۔

نینسی میری اداسی بن سکتی ہے۔

نینسی میری محرومی بن سکتی ہے۔

نینسی میرا غم بن سکتی ہے۔

— اور میں اٹھ اٹھ کر نقص گاہ میں داخل ہو گیا تھا تاکہ وس سچائی کو

لا دوں اگر یہ سچائی ہے۔

ایک لڑکی پر نظر میں جم کر رہ گئیں جو شلوار اور کرتا پہنے ہوئے تھیں۔ کہتے
 پر بڑے بڑے پھول رکھے پھولوں کا رنگ لال تھا۔ وہ گلاب سے زیادہ خوبصورت
 تھے اور ان میں دنیا کے پھولوں سے زیادہ خوشبو تھی یا پھر میں کچھ اسی طرح
 محسوس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ خاصی اچھی تھیں۔ اس کا سارا حسن اس کے بدن میں سمٹ کر رہ گیا تھا
 بدن جو بولتا تھا۔ بدن جو سازشیں کرتا تھا اور میں اس بدن سے قریب ہو گیا
 تاکہ نینسی کے خلاف سازش کر سکوں۔ اسے جھٹلا سکوں۔

جب تک وہ میرے ساتھ رہی میں بڑی گرم جوشی سے اسکے ساتھ ناچا رہا۔
 جب وہ مجھ سے جدا ہو گئی تو میں نے سوچا کہ آٹھ بند کر کے جو کھی پاس سے
 گزرے اسے ٹیگ کر دینا چاہیے۔ یہ بھی ایک دلچسپی کا شغل تھی۔
 سو میں نے کیا۔ ایک سردار جی دو قدم پیچھے ہٹ آئے۔

میں نے آگے بڑھ کر عورت کی کمر میں ہاتھ ڈالنا چاہا۔ لیکن مجھے اس کی کمر
 کہیں نہیں ملی۔ ایک آناج کی بوری تھی جسے میں سمٹنے کی کوشش کر رہا تھا
 میں بڑھلا سا گیا۔ وہ بانپ رہی تھی۔ مجھے اپنے دماغ کو اس کی سانسوں سے
 بچانے میں بڑی مردانگی بتانی پڑی۔ ہم ناچ کیا کر رہے تھے۔ میں بھرپور دھڑکن
 رہا تھا۔ میں جھوم رہے تھے بلکہ یوں کہیے ہاتھ کی طرح جھول رہے تھے۔ اس
 ہاتھ کی طرح جس کا ہمدست اس کی سونڈ ہلا کر اسے پکا رہا ہو۔ میری
 کسمپرسی دیدنی تھی۔ میں نے بڑی حسرت سے ادھر ادھر دیکھا۔ کوئی مرد مجاہد نہ
 تھا جو میری طرف بڑھے اور اس ”فرہ اندام“ حسینہ کو میری بانہوں سے جدا کرے۔

سردار جی بجائے کسی اور کے ساتھ ناچنے کے قریب ہی ایک کونے میں کھڑے
 ہمیں تاک رہے تھے۔ میری نظر ان پر پڑی تو میں نے اپنا دل نکال کر رکھ دیا۔
 وہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھے اور میں نے شکرِ یے کے ساتھ ان کی بوری جوں کی
 توں ان کے حوالے کر دی۔ اور جب تک میں اس بوری کے ساتھ رہا ہوں اس
 پورے وقت میں سنسنی مجھے یاد ہی نہیں آئی۔ لیکن سنسنی کی یاد سے بچنے کے
 لیے میں بار بار خود کشی کیسے کر سکتا تھا۔

اس حادثے نے میرا دل سہا سگون بھی چھین لیا۔
 جی جیسے ہر چیز سے ادب گیا ہو۔

گلابی رنگ کا اسکرٹ پہنی ہوئی ایک حسینہ جو انگلش اور انڈین منسل کی
 آمیزش معلوم ہوتی تھی ایک بہت ہی بانگے اور سچیلے نوجوان کے ساتھ ناچ رہی
 تھی۔ وہ کچھ اس قدر انہماک سے ناچ رہے تھے کہ انھیں منٹ بھر کے لیے جدا
 کرنا بھی مجھے گوارا نہ تھا۔ لیکن وہ جب میرے مقابل آگے تو میں نے آؤ کسٹرا کے
 اشارے کو غنیمت سمجھا۔ نوجوان نے اس کی کوئی پروا نہ کی۔ ظاہر ہے
 مجھے یہ بھی تو گوارا نہ تھا کہ تہذیب سے گری ہوئی اس کی اس حرکت کو سہہ لیتا۔
 میں نے ذرا فورس سے پھر ٹیگ کیا۔

نوجوان ہٹ آیا۔

مسٹر بلڈ حسینہ میری بانہوں میں تھی۔ اس کے کپڑوں سے سنسنی بھینی سی
 خوشبو پھوٹ رہی تھی اور یہ خوشبو مجھے سنسنی کی یاد دلانے ہی تھی اور سنسنی کی یاد
 مجھے پھر اس کو رہی تھی۔

مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے میں خود اپنے ہی ساتھ ناچ رہا ہوں۔
 حسینہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اور وہ میرے ساتھ ناچتے ہوئے انہیں
 چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن میں نے اس کی پھپھکی ہوئی آنکھیں صاف
 طور پر دیکھ لی تھیں۔

جب میں اس سے جدا ہوا تو مجھے محسوس ہوا جیسے میں منیسی سے جدا ہو رہا
 ہوں۔ جیسے خود اپنے آپ سے جدا ہو رہا ہوں۔

میں اس طرح ڈانس ہال سے چلا آیا جیسے میں خود نہیں چل رہا ہوں کوئی مجھے
 کھینچے لیے جا رہا ہے۔

میری نظر جہانگیر پر پڑی جو کبھی میرا کلاس فیلو تھا۔ اس نے مجھے دس کیا
 وہ اس حسینہ کے ساتھ ناچ رہا تھا جس کا بدن بولتا ہے۔ جس کا بدن سارن
 کرتا ہے۔

وہ حسینہ جس کے جسم سے کھینچی جینی خوشبو پھوٹتی ہے اور جو اپنی آنکھوں
 میں بڑی احتیاط سے آنسو چھپائے رکھتی ہے پھر اسی بلکے اور سچیلے نوجوان کے ساتھ
 ناچ رہی تھی جو خود بھی شاید اس کے آنسوؤں کی حفاظت کرتا ہے۔

سردار جی کو غالباً میں نے دہشتہ بھلا دیا جو اپنی غلے کی بوری سمیٹے ہوئے
 کہیں ہوں گے۔

یوں البتہ ایک بڑے عجیبہ کھ نوجوان کے ساتھ ناچ رہی تھی۔
 میں نے ہان پانگے لیے بیرے سے کہا اور سگریٹ جلا کر ایک سیز سنہالی لی۔
 ڈانس ہال میں خوشیاں زیادہ تھیں۔ غم کہیں کہیں تھا جیسے خوشیوں کی پوش

سے پھپھکتا پھر رہا ہوتا۔

مجھے محسوس ہوا جیسے میں بھی پھپھکتا پھر رہا ہوں۔

میں نے کبھی جاکی کو رقابت کے جذبے سے نہیں دیکھا تھا۔

نہیں جب وہ دوسری دفعہ مجھ سے بار میں ملا تھا۔ جب کہ منشی

نہیں اسی کے ساتھ تھی۔ لیکن باتیں کرتے کرتے منشی نے مجھے کچھ اے

دیکھا تھا جیسے چار پانچ دن سے مجھ سے بالکل نہ ملنے پر ندامت محسوس

دیے۔ دروازہ ہم کم ہی ملتے تھے۔ لیکن شام کے وقت کہیں کہیں تو مل

جاکی اس سال کی سیزن میں دھیرہ دون سے آیا ہوا تھا ا

ہو جانے پر بھی اب تکتا نہیں تھا۔ اس سے منشی کی پہلی ملاقات میرے

ڈانس میں ہوئی تھی پھر وہ ایک دوسرے سے ملنے لگے تھے۔ اس

اس کو سیر راہ کئی بار جاکی کے ساتھ گھومتے ہوئے دیکھا تھا۔ اور

نظر آئی تھی اور بہت ہی خوبصورت کپڑوں میں ملبوس نظر آئی تھی

ہوا کہ صبح کو پہنا ہوا اسکرٹ میں نے شام کو اس کے سجیلے بدن پر نہیں

اس کا یہ بناؤ سنگا رہا جاکی کی خوشحالی کی نشاندہی کرتا تھا وہیں

کا احساس بھی دلاتا تھا۔ میں نے خود کو اس طرح قسلی دے لی کہ چلو

دوست کا مستقبل سرتوں کے گلے میں بائیں ڈائے زندگی سے پیارا

میں نے کوشلیا کی طرف اپنی توجہ مبذول کر دی جو ایک خانگی انسٹی ٹیوٹ

میں انگریزی پڑھاتی تھی۔ جو بہت شریلی تھی۔ جو جو م لینے سے عورت

تھی۔ مجھے معلوم ہوا کہ جاکی منشی پر بے دریغ روپیہ صرف کر رہا تھا

میٹنگ میں اس کے ساتھ ریس کو رس جاتے لگی ہے۔ کبھی کبھی اس کی علاقائی ماں بھی اس کے ساتھ ہوتی ہے جو قریباً اس کی ہم عمر ہے اور اس کا باپ بھی جو ماں اور بیٹی سے دو گنی عمر کھا چکا ہے۔ مجھے اس کا بھی پتہ چلا کہ یہ لوگ ریس کھیل بھی لیتے ہیں اور یہ سب جاکی ہی کی جیب کا رہین منت ہے۔

مجھے ان ساری باتوں کو سن کر کبھی کبھی جاکی سے رقابت نہ ہوتی۔ اس کی دو بات شاید یہ ہوں کہ۔۔۔

زندگی کی نفس گاہ میں نینسی میرے لیے ایک ایسا سا کھتی کھتی جو صرف ٹیک کرنے پر مجھ سے جدا ہو جاتا ہے۔

زندگی کے شراب خانے میں نینسی ایک ایسی شراب کھتی جس کا حسن ہر جام میں ڈھل جاتا ہے اور جس کی حرارت ہر شیشے کو کچھلا دیتی ہے۔

میں اس کے پیچھے اس طرح بھاگ رہا تھا جیسے ایک پتہ تلی کے پیچھے وقت اور فاصلے کا خیال کیے بغیر بھاگتا ہے۔ لیکن آج جب کہ نینسی مجھے نظر انداز کر کے آگے بڑھ گئی تھی تو مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میں شاید اس کے نقاب میں بہت دور نکل آیا ہوں۔

اور آج میں جاکی کو کچھ اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے وہ میرے گھر آیا تو میں نے دروازے کے دونوں پٹ کھول کر اس کو خوش آمدید کہا، اس کی تواضع کی لیکن جب اس کو وداع کرنے کے لیے اٹھا تو وہ کچھلے دروازے سے جا چکا تھا اور مجھے اس وقت معلوم ہوا کہ میرے گھر میں کوئی کچھلا دروازہ بھی ہے۔

اور آج اسی کچھلے دروازے سے نینسی میرے ہمارے خانہ دل میں داخل

ہو رہی تھی۔

دہی نینسی جو رقص گاہ سے مجھ سے ملے بغیر جاکی کے ہمراہ کہیں چلی گئی تھی۔
دہی نینسی جس کا آج سے پہلے اس طرح میں نے کبھی انتظار نہیں کیا تھا۔
میں اپنی میز پر بیٹھا بیٹھا ڈانس ہال کے جگمگاتے ماحول سے بے نیاز جاتے
کہاں کہاں رہا۔ لیکن میں پھر رقص گاہ میں لوٹ آیا تھا۔ میرے کلاس میں
ابھی کھوڑی سی دہکی باقی تھی۔

میں نے دہکی ختم کر لی اور ڈانس ہال میں جانے کے لیے اٹھا۔
میں نے دیکھا نینسی سگریٹ کے دھوئیں کے پیچھے اپنا چہرہ پھپھائے ڈانس
ہال کے نیچے صحن میں کھڑی..... کچھ تلاش کر رہی تھی۔ جاکی اس کے ساتھ نہ تھا
اور دھوئیں کی چادر آہستہ آہستہ ہٹ رہی تھی۔ اور اس کا بھرہ نمایاں ہو رہا تھا
کہ اس کی نظریں میری نظروں سے ملیں۔

اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے بلایا۔

کسی بے نام سی خوشی نے مجھے لمحے بھر کے لیے گدگد کر چھوڑ دیا۔ نینسی نے
مجھے نظر انداز نہیں کیا تھا۔ وہ جاکی کو کہیں چھوڑ کر میرے پاس چلی آئی
تھی، اور یہ خیال میرے ان سارے جذباتوں کو جھٹلا رہا تھا جو اس کے عیاب
نے مجھ میں پیدا کر دیے تھے۔

لیکن میں چاہتا تھا کہ نینسی ایسی کوئی بات محسوس ہی نہ کرے۔

میں اس کی جانب اس طرح بڑھ رہا تھا جیسے اپنی ساری دلچسپیوں کا اس کی
خاطر خون کر رہا ہوں۔ میں اس کے قریب پہنچا تو اس نے میرا ہاتھ تھام

کر مجھ سے باہر چلنے کے لیے کہا۔

اس کا گلہ نہ دھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔

جب ہم پر سبز سے باہر نکل گئے تو آپس میں کچھ کہنے سے بغیر چلتے رہے۔
 آپس کو رس کے قریب پہنچ کر وہ میرے سینے پر سر رکھ کر سسکنے لگی۔
 میں نے اس کو اپنی بانہوں میں لے کر اس کے آنسو پونچھے۔ اس کی ادا

کا سبب پوچھا۔

جی چاہا اسے بتلا دوں کہ میں بھی اس کے لیے اتنا ہی ادا اس تھا۔
 جی چاہا اسے بتلا دوں کہ آج جب مجھے اس کی جدائی کا احساس ہوا تو
 میں ایسے ہونٹوں کو بھی نہیں چوم سکا ہوں جو میرے لیے بھول کی طرح کھل
 رہے تھے۔

لیکن میں کچھ بھی تو نہ کہہ سکا۔

صرف اس کیفیت کو چھپاتا رہا جو آنسو بن کر ساری ہستی پر چھا جاتی ہے۔
 منہ سی پکھ بولنا چاہتی تھی۔

اور میں سب کچھ سن کر مینا چاہتا تھا۔

اس نے بہت ہی آہستہ سے کہا جیسے بہت بلندی سے بول رہی ہو
 اور میں اس کی آواز کے آہستہ کے نیچے کھڑا اپنی آنکھیں بھگو رہا تھا،
 اپنا دل بھگو رہا تھا۔

”جا کی سسٹر کو لے کر بھاگ گیا ہے (وہ اپنی علاقائی ماں کو سسٹر پکارتی
 تھی) وہ کہہ گئے ہیں کہ میں تین چار دن تک ڈیڑی کو کسی طرح دھو سکے میں؟

رکھوں۔ میں ایسا کس طرح کر سکتی ہوں۔ لیکن اسے یقین ہے کہ ہر کام لے سکتا ہے۔ اس نے جاتے ہوئے مجھے صرٹ ایک بار گنیا ہے کہ میں تم سے کہہ دوں کہ وہ تمہارے بھول کو اپنے کوٹہ سجا سکتا۔

میں نے پھر محسوس کیا کہ نینسی میرے گھر اسی پچھلے دروازے ہو رہا ہے جس دروازے سے کبھی جا کی باہر نکل گیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ نینسی میرے لیے نہیں آئی اس کی مجبوراً لیے آئی ہے۔

اس کی لٹی ہوئی محبت میرے لیے آئی ہے۔
نینسی تو جا کی کے ساتھ بچا چکی تھی۔

کوئی مجھ سے سرگوشی کرنے لگا۔ تم بھی تو اس نینسی کے ہو۔ تم بھی تو اس نینسی کے ساتھ بچا چکے ہو۔ لیکن میں جواب دہی نہ دے۔
”یہ بھگٹا ہے، یہ بھگٹا ہے۔“

پیرسیر سے آرگسٹر کی مدھم مدھم لے ہواؤں کے دوش پر سوار ہو کر پہنچ رہی تھی۔ ساتھ ہی کچھ ایسی آوازیں بھی تھیں جس سے اس بات کا ہوتا تھا کہ نیا سال شروع ہو چکا ہے۔ پیرسیر میں لوگ نئے سال کو کوکھٹا کرنا چاہے ہوں گے۔ جا کی کا موٹر ہواؤں سے باتیں کر رہا ہوگا۔ آرگسٹر جا کی سے لگی ہوئی سوچ رہی ہوگی کہ اس کا بوڑھا شوہر خواب میں سال سے گلے مل رہا ہے۔

موٹر پر گرے ہوئے مینسی کے آسوا ب خشک ہو گئے ہوں گے اور ان پر گودھم نمی ہوگی۔

مجھے خاموش پا کر مینسی نے مجھے دیکھا۔

میں نے نظریں جھکا لیں۔ پھر میں نے کچھ رک کر امانیشی نیا سال شروع ہو چکا ہے۔

وہ بڑھی اس نے اپنا سر پھر میرے سینے پر رکھ دیا۔ میری قمیض اس کے آنسوؤں سے نم ہو چکی تھی۔

پھر یکایک وہ سنبھل کر پیچھے ہٹی۔ رک کر میرے کوٹ کے بٹن درست کیے۔ پھر خلاؤں میں کچھ دیکھا اور دو قدم بڑھ کر نئے سال کا جازہ اس نے اپنے کندھے پر بڑی احتیاط سے اٹھالیا۔

میں نے اس بوجھ کے اٹھانے میں اس کی کوئی مدد نہیں کی۔

بس کھڑا ہوا چپ چاپ دیکھتا رہا۔

یہاں تک کہ وہ ٹیکسی میں سوار ہو چکی تھی۔

میں تو سدا کا تماشائی ہوں۔

شعور سفر منزل

شعور

”قنبر علی کی گھوڑی میری“

”شیخ محبوب کا گھوڑا میرا“

”سید ابراہیم کا تازی اسپ میرا“

”اور بھیا آپ کچھ نہیں لیتے۔“

”بانو میری، بانو میری، بانو میری — بھیا بانو کو تاکتے ہوئے اس طرح

کہتے کہ وہ ان کی آواز سن لیتی اور نیچی نیچی نظروں سے انھیں دیکھتی ہوئی پرے

بڑھ جاتی۔

”نیا صوفہ سٹ میرا“

”ڈیٹنگ ٹیل میرا“

اس طرح منیں بھئی پہلے ڈرائنگ روم کا سامان بانٹ لیں — کوئی معترض نہ ہوتا۔

”اچھا بھئی شیشم کی کچھ کرسیاں میری“
 ”قالین میرا“

لٹنگ تالیاں بجا کر ناپچنے لگتا۔ واقعی قالین پر کسی نے توجہ نہیں کی تھی۔ ڈرائنگ روم کی سب سے بڑھیا شے تو وہی قالین تھا۔ دادا ابا جب مشرق وسطیٰ کے دورے پر گئے تھے تو ایران سے لے آئے تھے۔

بھئی میرے لیے تم لوگوں نے کچھ بھی نہیں چھوڑا۔ ”پتہ نہیں مالی غنیمت تقسیم ہوتا رہتا تو بھیا کہاں سے آدھکتے۔“

”ہیں نا اتنی ڈھیر دن سی چیزیں۔ پنڈ کر لیجئے بھلا“
 وہ کچھ ادھر ادھر دیکھتے۔ جیسے ساری چیزوں کو بنور دیکھ کر نظروں سے
 نظروں میں پرکھ رہے ہوں۔ پھر ایک دم دبی دبی آواز میں پکارا اٹھے۔
 ”بانو میری، بانو میری، بانو میری“

ہم سب احتجاج کرتے۔ جو چیزیں ڈرائنگ روم میں موجود ہوں تقسیم ان ہی میں سے ہونی چاہیے۔

وہ مان جاتے۔ ”ہاں بھئی تقسیم ان ہی میں سے ہوگی“
 ”پھر بانو کہاں ہے؟“

”بانو کہاں نہیں ہے؟“ وہ نہیں پر زور دیتے۔
 ”یہاں نہیں ہے، ڈرائنگ روم میں نہیں ہے“

”ہے براہِ مہر۔“

”کہاں۔“

”یہیں۔“

”پھر نظر کیوں نہیں آتی؟“ ہم سب جھج اٹھتے۔ جھوٹا ہے،

جھوٹا ہے، جھوٹا ہے۔

وہ انگلی اپنے ہونٹوں پر رکھ کر تین اشارے سے چپ کرتے۔

اس طرح چلاؤ نہیں۔ ہم بتاتے ہیں۔ بس ہوجاؤ تیار دیکھنے کے لیے۔
ہو گئے۔ نا۔

”ہو گئے نہیں، ہو گئے ہیں، ہو گئے ہیں۔“

اور بانو بیچی بیچی نظروں سے بھیا کو دیکھتی ہوئی ہمیں سے پردے کے

پچھے سے براہِ مہر ہوتا ہے۔ اس طرح جیسے ان ساری باتوں سے بے نیاز ہوں

۔ گلدان میں پھول قرینے سے جھارتیں۔ یا پھر ڈسٹرے کر مر کے دس

سیاہی پر جو اپنے گھوڑے کی نکام تھامے کھڑا تھا اس طرح ایک دو عالمی حکم چلاؤ

جیسے پھول پھلا کر رہی ہوں، اور بے پاؤں دوسرے دروازے سے نکل

جاتیں۔ جیسے وہ چور ہوں اور کوئی شے چرانے کے لئے آئی تھیں۔

اپنی بار پر ہم بوجھلا جاتے بھلا ہٹ میں کوئی ڈھنگ کی بات نہ کر پاتے۔

سنی یکا یک جھج بڑتی۔ ”سند نہیں، سند نہیں۔“

”کس کی سند نہیں؟“

”بانو کی۔“

”کیوں؟“

”آدمی تقسیم ہوں تو آپ بانو کر لے سکتے ہیں“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ آدمی تقسیم کیے جاسکتے ہیں“

”کب“

”ابھی، اسی وقت“

”اگر میرے“

”وہی میری“

”باجی ہماری“

”بھوئی خانہ بھیا کی، بھوئی خانہ بھیا کی۔“ ہم بکا راٹھتے۔
بھیا اس طرح۔۔۔ ٹھٹھا ہے جیسے بچہ نہیں منیں گے۔۔۔ تم لوگ کن ہوتے
و بھوئی خانہ کو میرے حوالے کرنے والے ہم تو دبی چیزیں گے جو ہم کو دل سے
بستہ تھیں۔

”بیچاری بھوئی خانہ کو کون لیں گے؟“

”وہ لیں گے کوئی بھوئی خانہ آکر“ ہم کھلی کھلی ہنس پڑتے۔

”اے ٹھیکو تو بے لانا۔“

”نا بھئی بھئی کون پاؤں لانی کھلائے گا دن میں دو در وقت“

ادھر ہم سب بھیا سے بوجھ اٹھتے۔ ”رے دیں بھیا آپ کو کیا لگی ہے چیز؟“
کوئی لٹی بھئی چیز دے دو گئے اٹھا کر تو ایک ایک کو ایک ایک لٹا دیا
پر چڑھا دوں گا۔

”نہیں بہت عمدہ چیز دیں گے“

”ایک دم بڑھیا۔۔۔“

”ہاں ہاں بالکل۔۔۔“

”اچھا دے دو بھئی۔۔۔ دیکھیں تو کیا دیتے ہو“

”بافو بھیا کی، بافو بھیا کی، بافو بھیا کی“

گھر کی ایک ایک چیز جب اس طرح تقسیم ہو جاتی تو ہر چیز کا مالک اس پر اپنا اپنا حق اس طرح جتلاتا کہ اسکی بغیر اجازت وہ چیز استعمال ہی نہیں کی جا سکتی تھی۔ مہنی کو اپنے صوفے پر بیٹھا ہوتا تو ٹنگو میاں سے اجازت حاصل کرنی ہوتی کہ وہ قالین پر سے چل کر صوفے تک پہنچے۔۔۔ ورنہ ٹنگو میاں صاف ٹوک دیتے۔ اور مہنی قالین سے نیچے بچ کر صوفے کے پتھے کے قریب پہنچ کر چھوٹی مہنی کتیا کی طرح اچھل کر صوفے پر جا برا جیتی۔ اور بڑی احتیاط سے اپنے پیر سمیٹ لیتی کہ مبادا پیر قالین سے مس نہ ہوتا کیس۔ ایسے میں بچا رے ٹنگو میاں کو بھی قالین ہی پر برا جتنا ہوتا اور انہیں صوفے پر بیٹھنے کی اجازت نہ ملتی۔

”مہنی۔۔۔“

”جی بھیا۔۔۔“

”یہ ٹنگو میاں بچا رے غلاموں کی طرح نیچے کیوں بٹھا دیے گئے“

ٹنگو میاں ناک بھوک پڑھاتے۔۔۔ بھلا وہ اور مہنی کے غلام کہلائے جائیں۔

بھیا کو بھی قالین پر قدم رکھنے سے وہ روک دیتے اور کھٹ سے قالین پر سے

کھڑے ہو جاتے، پھر ٹٹلنے لگتے۔

”بھئی ہم تو ٹنکومیاں کی طرح اپنی ہیز کو چھونے سے کسی کو بھی نہیں روکنے
 لے۔“

”پھر مہنی جو مجھے صوفے پر نہیں بیٹھنے دیتی ہے، یہ ٹنکومیاں شکایت کرتے
 ”اور جو تم قالین پر پیر بھی دھرنے نہیں دیتے۔“ مہنی جواباً کہیں لٹاڑتی۔
 ٹنکومیاں ہم بھارے قالین پر سے ہو کر مہنی رانی کے صوفے تک
 پہنچ جاتیں؟“

ٹنکومیاں بڑھ کر بھیا کا ہاتھ پکڑے کہیں گھسیٹے اور اس طرح وہ مہنی رانی
 صوفے تک پہنچ جاتے۔۔۔ صوفے پر بیٹھ کر وہ بغور ادھر ادھر دیکھنے لگتے
 ۔۔۔ پھر اطمینان سے سگریٹ جلا کر ایک لمبا سا کش لیتے اور سامنے بے شمار
 ل گول دھوئیں کے حلقے بکھر جاتے۔ ٹنکواؤں میں ایک دوسرے پر سبقت
 دے جانے کے لیے دھوئیں کے حلقوں میں اپنے ہاتھ اس طرح داخل کرتے جیسے وہ
 ہمارے دائروں کو محفوظ کر لیں گے۔ بھیا سگریٹ کا لطف اٹھاتے جاتے
 رکن انکھیلوں سے دروازوں میں کچھ تلاش کرتے رہتے۔

ہم سمجھ جاتے۔ بھیا بھی کون سے ایسے بڑے بزرگ تھے۔ امی نے کل ہی
 بات ہے کہ سگریٹ فوشی پر ان کے کان اٹھتے تھے۔۔۔ پس ذرا شہر
 باکر پتہ نہیں کون سے کالج میں پڑھنے لگے تھے وہ۔۔۔ ابھی تو ان کے ڈاڑھی
 ہی نہ آبا کی طرح بڑی بڑی مٹکھپیں۔۔۔ دھان پان سے پھوٹی مونی سے لگتے
 تھے ہمیں۔۔۔ امی سے پن بچھوٹا تو لگے کو نے میں بے جا کر ہماری منہیں کرنے۔
 ”باتو سے نہ کہنا کہ امی نے ہمارے کان اٹھتے ہیں۔“

ہم لوگ پتہ نہیں یہ بات بانوسے کہہ دیتے یا نہ بھی کہتے — لیکن کھیا
جب اس طرح منتیں کرنے لگے تو ہمیں بات کی اہمیت کا احساس ہوا۔
”پھر نکالیے پچا کلیٹ“ مہنی چلائی۔

”دور نہ میں بانوسے“ ٹٹکومیاں نے دھونس جمائی۔

”اچھا ابھی“ انھوں نے بازوؤں سے پکڑ کر ایک ایک کو اٹھا لیا، اور
المانی پر چڑھا کر چل دیے۔

ٹٹکومیاں بے چارے کیسے سہمے ہوئے تھے۔ کاٹو تو او نہیں بدن میں۔
مہنی شروع شروع تو کچھ لطف اٹھاتی رہی۔ جانے المانی کا یہ سٹ
کس طرح کھل گیا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے اڑا اڑھم دیکھتے دیکھتے زمین پر
آ رہے گی۔ ایک دم مہنی کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ ٹٹکومیاں پر
رفت طاری ہو گئی اور جب بھیا المانی کے برابر سے نکل آئے تو ٹٹکومیاں
کی آنکھیں جھرنے کی طرح بھر جھربہ رہی تھیں۔

یہ المانی پر بڑھا دینے کی سزائیں آج یاد آتی ہیں تو جی چاہتا ہوں کہ
کوئی وہ عمریں بل جھرنے کے لیے لوٹا دے۔

آج پھر ہم سب کے لیے رات جگا تھا۔ اب صبح ہوتے ہوتے دورے کے
لیے نکلنے والے تھے۔ امی اور ہم سب کے سب ساتھ تھے۔ دل میں پچھلے
سی پھٹ رہی تھیں۔ کہتے ہی بارہم بستر دل پر بھجوا دے گئے۔ لیکن نیت تھی کہ
آنکھوں سے دیکھتے ہی نہ کر پاتی تھی۔ رخصائیوں سے چہرے نکالے ہم سارے گھر کا
جائزہ لیتے۔ بالو آیا انتظام میں مصروف تھیں۔ ادھر کچھ دلوں سے ہم بانوسے

ذرا پکارنے لگے تھے۔ بھیا نے کہہ رکھا تھا کہ اگر انھیں بانو آ یا نہ پکارا جائیگا وہ سب کے حقوق تلف کرتے پھر میں گے کسی کی بات نہیں مانیں گے۔ ٹنگو میاں، قاتلین کو ان کی اجازت کے بغیر جوتوں سے رو نہیں گئے۔ منی کے دفے پر اپنے فونٹن پن کی روشنائی انڈیل دیں گے۔ پھر یہ بھی تائیں تھیں کہ اگر پوچھیں تو انھیں بتلایا نہ جائے کہ بھیا نے یہ سب کچھ سکھایا ہے۔

ہمیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ بانو آ یا ادھر کچھ دنوں سے ہمیں کچھ وہ بھی اچھی لگنے لگی تھیں۔ بھیا کے سوٹ کس سے چاکلیٹ نکال کر ہمیں بیان سے دے دیتا جسے وہ بھی اس سوٹ کس کی مانگن ہوں۔

ٹنگو میاں کہتے جلدی کچھ بانو آ یا بھیا دیکھ لیں گے کہیں۔ وہ مسکراتیں۔ کیوں کیا مجھے تھارے بھیا کا ڈر ہے۔

ٹنگو میاں کچھ حیران حیران سے رہ جاتے۔ کوچی دن دھاڑے سوٹ کیا بولی کر چاکلیٹ نکال رہی ہیں۔ پھر نہ ڈر نہ خوف۔

لیکن آہستہ آہستہ ٹنگو میاں سمجھ گئے کہ بانو آ یا چاکلیٹ تو کیا سارے کا اور سوٹ کس اٹھا کر جس کسی کو چاہے دے سکتی ہیں۔ یہ حق انھیں کس نے ابھقا۔ وہ نہ منی کی سمجھ میں آیا، نہ ٹنگو میاں کی۔

رضائی کو برے پھینکتے ہوئے ٹنگو میاں نے بانو آ یا کو تاکا جو دالان میں ٹری ناشتے کی چیزیں لٹکیوں اور ٹفن باسکٹس میں رکھ رہی تھیں۔

شیٹ۔ شیٹ۔ اور بانو آ یا نے گھوم کر دیکھا۔

ٹنگو میاں نے اشارہ دل ہی اشارہ دن میں انھیں ہوا کہ کیا کہ رضائی بھیا کی

بستر سے کود پڑیں۔

مہنی بھی رضائی سے منہ نکالے مٹ مٹ ساری باتوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ بانو آپا کی اجازت مل جانا اس بات کا ثبوت تھا کہ ابا، امی اور خالہ بی سب کی سب سوچیں ہیں۔

”ٹنکو میاں آگے آگے تھتے پیچھے مہنی رانی۔“

”ہاٹ نکس میرے۔“

”ٹنکو باسکٹس میرے۔“ ٹنکو میاں چلائے۔

”اے میرے تیرے کے بچے۔ بھاگ جا یہاں سے، شور مچایا تو۔“
لوچی بھیا کو اڑکی اوٹ میں کھڑے، تولیہ ہاتھ میں لیے پلیٹیں خشک کر کے بانو آپا کو دیتے جا رہے تھے جنھیں وہ بڑے سلیقے سے باسکٹس میں رکھ رہی تھیں۔
بانو آپا نے ایک قاب میں سے بادام کے لوز کا ٹکڑا نکال کر ٹنکو میاں کے منہ میں کھونس دیا تو وہ لگے تالیاں بجایا کر ناچنے۔

مہنی نے منہ کھکھایا تو بانو آپا نے اس کی تواضع کی۔

”چلو اب تم لوگ بلدی سے جا کر اپنے اپنے گرم کوٹ پہن آؤ۔ سردی نہیں لگ رہی ہے تمھیں؟“ بانو آپا نے بڑے پیار سے حکم دیا۔
ہم جانے لگے تو انھوں نے کہا۔ ”بس چپکے سے پہن آنا۔ کھٹ پھٹ کی تو تھمارے بھیا۔ اور وہ چپ ہو گئیں۔“

المادی کھولی گرمی نے اپنے گرم کوٹ اس طرح نکالے جیسے چوری کر رہے ہوں۔
بیل گاڑیاں غالباً احاطہ میں لا کر کھولی دی گئی تھیں۔ رات کے سناٹے میں

ان کے گلوں میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی آواز ہمیں صبح کو شروع ہونے والے سفر کے لیے ابھی سے اکسا رہی تھی۔

منی نے گرم کوٹ کے بٹن لگاتے ہوئے شہ دی۔

”میں جاکر ابھی سی بیل گاڑی جن لیتی ہوں“

اور ٹنکو میاں سر پٹ بھاگے۔

”لال پہیوں والی بیل گاڑی میری“ منی نے اعلان کیا۔

اور ٹنکو میاں دل موس کہہ گئے دوسری بیل گاڑیوں کے پیچھے لال تھے

ہی نہیں۔

بیل گاڑیاں تقسیم ہو گئیں۔

بیل تقسیم ہو گئے۔

انگھٹے ہوئے گاڑی بان تک تقسیم کر لیے گئے۔

منی بھیا کو خوش خبری سنانے کے لیے بھاگی کہ لال پہیوں کی سب سے اچھی

بیل گاڑی اس نے جن لی ہے۔ اور بھیا کی غفلت کے باعث ایک خالو سی گاڑی

ان کے لیے بچ رہی ہے۔

ٹنکو میاں نے بھی بڑی عمدہ سی بیلوں کی جوڑی ہتھیلی لی تھی۔ وہ بھلایہ خوش خبری

کس طرح نہ سناتے۔

بھیا کے پاس ہم پہنچے ہیں تو اپنا ایک گرم کوٹ وہ بانو آپا کو پہنا کر اس کا

کالر ٹھیک کر رہے تھے اس طرح کہ بانو آپا کا گلہ اور کان بھی سردی سے محفوظ

ہو جائیں۔ خود انھوں نے بھی ایک کوٹ پہن رکھا تھا۔

مٹی ٹکڑے ٹکڑے بانو آیا کو دیکھ رہی تھی۔ وہ واقعی اچھی لگ رہی تھیں۔
 ٹٹو کہنے لگا۔ اب کی بار آدمیوں کی تقسیم ہو تو میں بانو آیا کو لے لوں گا۔
 بھیانے مسکرا کر بانو آیا کو کچھ اس طرح دیکھا جیسے اپنی ساری ہستی ان پر
 لٹا رہے ہوں۔

”بانو“ یہ ابا کی آواز تھی۔

ہم سب کے سب پاؤں دبا کر بھاگے اور اپنی اپنی رضائیوں میں جا دکے۔
 بانو آیا بہت بھرتی سے بھیا کا گرم کوٹ اتار رہی تھیں اور بھیا کچھ اس
 طرح بانو آیا کو تک رہے تھے جیسے اپنی نظروں کے تانے بانے میں بانو آیا کو ہکڑ
 کر ان کو سردی سے بچا رہے ہوں۔

”بانو“ ابانے پھر پکارا۔

بانو آیا۔ ابا کی خواب گاہ کی طرف لپکیں تو دروازے تک پہنچے پہنچے
 انھوں نے دو تین بار بھر چھری سی لی اور ان کا تازک سا جسم ایک بار تو اس طرح
 کپکپایا جیسے نیچ صحن میں پیوندی آم کے درخت کی وہ ٹہنی جو آموں سے لدی
 ہوئی ہلک ہلک کر چنبیلی کی بیل کو گرما کی شاموں میں چوم چوم لیتی تھی۔

بھیا کے ہاتھوں میں بانو آیا کا اتارا ہوا کوٹ اس طرح جھول رہا تھا جیسے
 بھیا، بھیانہ ہوں بلکہ برآمدے میں دھرا ہوا لکڑی کا وہ اسٹینڈر ہوں جن پر
 کوٹ ٹانگے جاتے ہیں۔

جی ہاں ساری چیزیں تیار ہو چکیں۔

جی ہاں میں نے سب کچھ رکھ دیا ہے۔

جی ہاں —

ہم نے بہت کوشش کی پھر بھی اتنا ہی سن سکے۔ اور یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اب اچھلنے کی تیاری ہی کے بارے میں سوالات کر رہے ہیں۔

بانو آیا باہر نکلیں تو بھیانے بڑھ کر کوٹ انہیں پھر پہنا دیا۔ وہ اسی طرح شانِ استغنا سے کوٹ پہن کر آگے بڑھ گئیں جیسے یہ ان کا روزانہ کا معمول ہو۔ جیسے بھیا ان کے ادنیٰ ملازم ہوں جو صرف اسی کام کے لیے رکھے گئے ہوں۔

ہمارے دروازے کے قریب پہنچیں تو ہم دم سادھے انہیں تک لے گئے۔ کسی نے سر سے پیر تک رخصتی تان رکھی تھی انہوں نے ہلکی سی تالی بجائی۔ ہم سمجھ گئے کہ یہ سنگٹل ہمارے لیے ہے۔ ہم نے دیکھا تو وہ ہاتھ ہاتھ کر ہمیں اس طرح بلارہی تھیں جیسے غلام احمد اور لکی پکڑ دانتے کے لیے فیملی ادرنگ کر رہے ہو۔ ہم بھاگے بھاگے بانو آپا تک پہنچے تو انہوں نے بڑے ٹھکاندہ انداز سے کہا — لائین میں کھڑے ہو جاؤ۔

ہم سب لائین میں کھڑے ہو گئے تو بھیا بھی آکر ہم میں مل گئے۔ بانو آیا مسکرائیں، کہنے لگیں، کہ آدھے گھنٹے کے اندر اندر کپڑے پہن کر ہم لوگ تیار ہو جائیں۔

بھیا تعظیماً بھگے۔ دوسرے ہو کر اس بات کا اندازہ کر کے کہ بانو آیا کے احکام کی بے سرچشم تعمیل کریں گے۔

— بھیا کو دیکھ کر ٹنگو میاں بھی جھٹک پڑے۔

ٹنگو میاں کو دیکھ کر ہم سب جھٹک پڑے۔ لیکن بانو میاں نے مار دی

تھی۔ بانو آپا نے انھیں بازوؤں سے پکڑ کر اٹھا لیا اور چپٹ چپٹ دو چھوٹے چھوٹے
سے پیار ان کی پیشانی پر جڑ دیے۔

کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بانو آپا اب وہ بانو نہیں رہی تھیں جو کچھ دن
پہلے تک سہمی سہمی لجائی لجائی سی ہمارے اور بھیا کے آگے سے گزر جاتیں۔ ان
میں کوئی ایسی بات پیدا ہو گئی تھی جو بانو آپا کے شایانِ شان تھی اور ہمیں ان کا
یہ نیا روپ بہت بھاتا تھا۔

سفر

چاندنی سادی زمین پر پھیل بھیل کر اس طرح لیٹ گئی تھی کہ اب کبھی سورج
طلوع ہو گا نہ اسے شرماء اور لجا کر، سکرٹنا سمٹنا پڑے گا۔ رات حسین تھی،
رات کی خاموشیاں حسین تھیں۔ دودھیائی چاندنی میں آہستہ آہستہ منزل کی
جانب بڑھنے والا ہمارا قافلہ — ستاؤں اور خاموشیوں کی دنیا میں آواز
اور زندگی تقسیم کر رہا تھا۔ ایک جانب ہرے ہرے کھیت دور دور تک کھائی
دے رہے تھے۔ دوسری سمت ایک چھوٹی سی پہاڑی تھی۔ پہاڑی کے نشیب
میں لوگ کہتے ہیں کہ شیوجی کا مندر ہے مندر کے نیچے لوگ کہتے ہیں ایک ندی
بہتی ہے جس کا پانی اس قدر ٹیٹھا ہے کہ کھلی ہوئی مصری معلوم دیتا ہے۔ ہاں
اور لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ جس کے اولاد نہیں ہوئی وہ اس ندی کا پانی پی لے تو اس کے
اولاد ہو جاتا یقینی ہے۔ خالہ بی کی مرعی بالکل ہے۔ مٹی یقیناً سوچ رہی ہے کہ
وہ خالہ بی سے کہے گی کہ وہ اپنی کلمو ہی مرعی کو اس ندیا کا پانی چوا آئے۔ اس نے
ٹنکومیاں سے اس بات کا تذکرہ کیا ہے — ٹنکومیاں کچھ سوچ رہے ہیں۔

پھر لکایک چونک کر انھوں نے منی سے پوچھا ہے۔

”منی دیدی اگر خالہ بی کو بھی اس ندیا کا پانی پلا دیں تو پیٹاٹ اٹھیں بھی بچے ہو جائیں گے نا؟“

”شکرمیاں، منی پر تہربان ہیں۔ تب ہی تو منی دیدی کہا ہے۔ بات شکرمیاں نے معقولی کی ہے۔ منی کو یاد آیا کہ واقعی خود خالہ بی بھی تو بے اولاد ہیں۔ اور یہ بات ساری بیل گاڑی میں پھلجھڑیاں پھڑدار ہی ہے۔ سب ہنس رہے ہیں۔ جھوٹے پھوٹے ہنسنے، ننھی ننھی لگا لگائیاں، بیلوں کی گھنٹیوں کی سرسائی، ٹن ٹنٹنٹن۔ پیہوں کی سرخ چوں۔ گھوڑوں کے ٹاپوں کی ٹپ ٹپ۔ آوازوں کا یہ قافلہ خاموشیوں کے سینے میں اتر رہا ہے۔ دوستیاد کیفیتیں اپنا تضاد کھود رہی ہیں۔ جہاں مختلف آوازوں کے اس قافلے پر دودھیا فی پھانڈ میں سوکے ہوئے سائے کا گمان گزرتا ہے تو کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساری چٹکی ہوئی چاندنی بول رہی ہے۔ کھیت بول رہے ہیں۔ جھومتے جھامتے درخت بول رہے ہیں۔ وہ پہاڑی بول رہی ہے جس کے نیچے شیرجی کا مندر رہے اور اس مندر تک پہنچانے والی پگھلڈی بول رہی ہے۔ سب چپ چاپ ہیں لیکن کامنات کی ہر شے کوئی خوبصورت سی سازش کر رہی ہے اور یہ سازش غالباً چٹکی ہوئی دودھ جیسی چاندنی کے خلاف ہو رہی ہے۔ اس کے حسین تساط کے خلاف ہو رہی ہے جو اس نے جنگل کی ہر شے پر جما رکھا ہے اور غالباً اس سازش ہی کے نتیجے میں سورج کہیں دوردیا دیا، چھپا چھپا چاندنی کے تعقب میں آگے بڑھ رہا ہو۔ لیکن وہ ان ساری باتوں سے بے نیاز ہے۔ اپنے ہی

حسن میں لگیں۔

بانو آیا ہماری ہی بیل گاڑی میں بچوں میں گھری بیٹھی ہیں۔ ابھی ابھی باتیں
 سیٹھی سیٹھی باتیں۔۔۔ سبز بیری کی کہانی جس کو کالے دیو سے پھڑانے کے لیے
 شہزادہ کا غلام سستی سستی کا پانی پی کر اور جنگل جنگل کی خاک چھان کر پوچھا تھا۔
 لیکن سبز بیری کو کالے دیو نے مینا بنا کر بجزے میں قید کر دیا اور شہزادہ کا غلام
 پہلے اس بجزے کی تلاش میں سرگرداں و حیراں رہا تاکہ سبز بیری کی زندگی
 محفوظ ہو جائے۔

کہانی کہتے کہتے بانو آیا کی نظر میں اردھرا دھر بھٹک جاتیں۔
 چسکی ہوئی چاندنی میں بھک سہید گھوڑے پر بھیا برجیس پہننے ہوئے
 سوار ہیں۔ وہ بڑے پھلے لگ رہے ہیں۔۔۔۔۔ بھیا کا گھوڑا جلتا ہوا بھوڑا
 ہے۔ اتنا ہی صحت مند، تن رو تیز اور شیریں ہے۔ چلتا اس طرح ہے جیسے شراب
 پی کر ہجوم رہا ہو۔ قدم بڑے متوالے متوالے ڈالتا ہے۔ ہر آواز پر کان
 کھڑے کر لیتا ہے۔ ہر چیز سے جھکتا ہے۔۔۔ سب آگے ابا کی بیل گاڑی ہے
 اور ابا کی بیل گاڑی کے آگے پانچوں گھوڑے سواہ ابی ابی تلواریں، سیام میں لٹکا
 باضابطگی سے بڑھ رہے ہیں۔ گھوڑے ان کے بھی صحت مند ہیں۔ چلتے ہوئے
 وہ بھی چوکنا چوکنا سے دکھائی پڑتے ہیں۔ لیکن بھائی جان کا گھوڑا کچھ زیادہ
 ہی جات و چر رہا ہے۔

اب بڑھٹ رہی ہے۔ وہ گاؤں جہاں ہمارا خیمہ نصب ہو چکا ہوگا
 چند ہی فرلانگ کے فاصلے پر رہ گیا ہے۔ ابا اپنا عہدہ سنبھالنے کے بعد پہلی بار

اس گاؤں کے دورے کے لیے آئے ہیں۔ یقیناً ان کا سواگت گاؤں کی رعایا اور
 سربراہ آدرہ لوگ اسی اہتمام سے کریں گے جس کو ہم نے ہرنے گاؤں میں
 ایک ہی انداز سے ہوتے دیکھا ہے اور پھر تاشوں جھانجھنوں اور ٹہلوں کی گت
 پر قبیلے کی گھوڑی اپنا ناچ شروع کر دے گی اور تلوار نیام سے نکالے
 تیرہ چاروں گھڑ سواروں کے بیچ اپنی ناچتی اور تھرتی گھوڑی پر بہت
 نازاں نازاں مسکرائے گا۔ چاروں گھڑ سوار بھی اپنی تلواریں نیام سے نکالے
 پوکس ہو کر قبیلے کی گھوڑی کے اطراف چلیں گے۔

غالباً بانو آپا اب یہ سوچ رہی ہوں کہ ایسے میں دیکھنا بھیا اپنا گھوڑا
 کہاں رکھتے ہیں۔ یقیناً بھیا..... گھڑ سواروں کے آگے آگے رہیں گے
 مگر یہ بھی سوچ رہی ہوں کہ گاؤں کی رعایا ابا کے ساتھ بھیا کو بھی پھولوں
 کے ہار پہنائے گی۔ اس لیے کہ بھیا ابا کے سب سے بڑے بیٹے ہیں۔ اتنے پیارے
 سے ہیں، شہر میں بڑھتے ہیں۔ پہلی بار ابا کے ساتھ دورے پر آ رہے ہیں
 — پتہ نہیں بانو آپا اس طرح سوچ رہی ہیں یا نہیں لیکن ٹھنکو میاں تو بالکل ہی
 سوچ رہے تھے۔ جب انھوں نے منی سے اس طرح کی بات کی تو منی تالیاں
 بجانے لگی۔

”تم تو بہت ٹھیک سوچتے ہو ٹھنکو“ منی نے کہا۔

”میں بولوں گی بانو آپا کو بھی پھول پہنا دو“ منی نے پھر اضافہ کیا۔

بانو آپا کان کی لوگوں تک سرخ سرخ ہو گئیں۔

”مجھے کیوں پھول پہناؤ گی؟“ انھوں نے منی کے گال پر چپت لگائی۔

بھیا یہ ساری باتیں بہت نہیں کس ریڈیو کے ذریعہ سن رہے تھے۔ اگھوڑ اگھما پھرا کر ہماری سیل گاڑی کے پیچھے آئے۔

کہنے لگے ”میں ساری باتیں سن چکا ہوں۔ سنی کا جواب میں دوں گا۔“
بھیا آگے ہیں تو بانو آپا کی زبان ہمیشہ کی طرح گنگ ہو گئی ہے لیکن ہمیں
کی طرح ان کی آنکھیں بھیا سے بہت کچھ کہہ رہی ہوں گی۔

سبھوں نے تو صرف اتنا ہی دیکھا ہے کہ بانو آپا شرمنا رہی ہیں۔
پھر بھیا نے ٹنکومیاں کو اشارہ کیا۔

وہ سیل گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ایک دم پھل پڑے۔

بانو آپا چونک گئیں کہ ٹنکومیاں کو بیٹھے بیٹھے یہ کیا ہو گیا۔ وہ صحیح طور
ابھی کچھ سمجھ بھی نہ پائیں تھیں کہ ٹنکومیاں بھیا کے بازوؤں میں پھول رہے تھے۔
پھر مزے سے بھیا کے آگے گھوڑے پر سوار مسکرا رہے تھے۔

بھیا نے ان سے سرگوشی کی تو وہ پٹ پٹ آنکھیں مار رہے تھے۔

بھیا نے انھیں گدگدایا تو وہ سنہیل کر کہنے لگے۔ بھیا پھول پہنیں گے تو بانو
آپا بھی پہنیں گی۔ اور ننگے تالیاں بجانے۔

بانو آپا نے بھیا کو گھور کر دیکھا تو مجھے ان کی آنکھوں میں محبت سے زیادہ
شکر کا بندہ نمایاں نظر آیا جیسے وہ ان کے اپنے اتنے ادیرا اٹھالیے جانے پر
بھیا کی ممنون احسان ہوں۔ لیکن اسی نگاہوں سے بھیا کو بانو آپا بہت کم دیکھنے
لگی تھیں۔ جب سے ہم لوگوں نے انھیں بانو آپا پکارنا شروع کر دیا تھا ہم
نے محسوس کیا تھا کہ انھیں بڑا اطمینان ہو گیا ہے۔ ایسا اطمینان جو آدمی کی کھوئی

ہوئی تو قیر کے داپس ملنے پر ہوتا ہے۔ لیکن آج باؤ آپا نے بھیا کو انھیں نظروں سے دیکھا جن نظروں سے وہ ان دنوں دیکھتی تھیں جب ہم انھیں صرت باؤ پکا گدھے، تو ہمیں آج کی باؤ آپا بڑی مختلف نظر آئیں۔ اتنی مختلف کہ ان کا اصلی روپ تو یہی معلوم ہوا۔

پھر بھیا نے ٹنگومیاں کو بازو سے تھام کر بیل گاڑی میں اس طرح جھوڑ دیا جیسے بانی سے بھرے جگہ میں کوئی برت جھوڑ دینا ہو اور گھڑے کو اسے لگا کر ہماری بیل گاڑی سے آگے نکل گئے۔ ٹنگومیاں نے چپکے سے ایک کاغذ کا ٹکڑا باؤ آپا کے ہاتھ میں تھا دیا تو وہ خوشی اور خوف کے ملے جلے جذبات سے کانپ ہی رہی تھیں۔

کاغذ میں کیا لکھا تھا باؤ آپا جانیں یا پھر بھیا۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ کاغذ پہلا کاغذ ہو گا جو بھیا کی طرف سے باؤ آپا کے نام آیا تھا۔

پھر بعد میں ٹنگومیاں مستقل طور پر یہ خدمات انجام دیں گے۔ ایسا مبرا اندازہ تھا۔

اب ہمارا قافلہ ایک ہرے بھرے کھیت کے باگن متوازی بیل ریل پر اب کھیت سفر کے باگن ملا ہوا ہے۔ چلتے چلتے بیل ریل کو دیکھ کر کھیت میں لہراتے پودوں پر ہمارے جاتے ہیں۔ ایسے میں بیل گاڑی کا اگلا حصہ ایک سمت میں جھک جاتا ہے۔ ٹنگومیاں اور بیل کافی محاذ پر ہوتے ہیں اور ٹنگومیاں مسرت اور خوف کے ملے جلے جذبات سے باؤ آپا سے چمٹ جاتے ہیں۔

گاڑی بان آواز نکالتا ہے۔ بیلوں کو دھککا جاسیے، ڈراتا ہے اس پر بھی وہ نہیں مانتے ہیں تو انھیں بیٹھا ہے پھر پکا رتا ہے اور کبھی کبھی تو انھیں کھانے کا موقع دے دیتا ہے۔ بے زبان جانوروں پر زیادہ جبر اس کو گوارا نہیں ہے یا پھر کھیت واسے کا کھوڑا سا نقصان اپنے مفاد کے مد نظر اس کو گوارا ہے۔ اس کے بیل بکھر کے ہیں کھیت پر چلتے چلتے سہو مار لینے سے بیلوں کی بھوک نہیں مٹتی۔ لیکن گاڑی بان کی تسلی ہو جاتی ہے۔ ان ساری باتوں کے باوجود آدمی برا نہیں ہے۔

سامان جن بیل گاڑی پر لدا ہے شاید اس کا گاڑی بان پٹلے سر دلیں مشہور شاعر دھاتی کا گیت اسی کے میں لگا رہا ہے جس دھن میں شاعر خود نظم سناتا تھا

آنتاں سہتا جا، بنتا جا، گانا جا
بندڑی واسے

یہ گیت دکن کی کھڑی بول میں لکھا گیا ہے۔ گاڑی بان کی آواز ہمیں صاف سنائی دے رہی ہے۔ اس گیت سے ہمیں اس بات کا احساس ہوا ہے کہ ہمارے بیلوں کے گلوں میں گھنٹیاں لٹن ٹٹنا رہی ہیں۔ یہ گھنٹیاں اس وقت سے بجا رہی ہیں جس وقت ہمارا قافلہ روانہ ہوا تھا۔ غیر محسوس طور پر ہم ان کی آواز بہت دیر سے سن رہے ہیں لیکن گاڑی بان کی آواز سے مل کر ان میں جو کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ ہمیں احساس دلا رہی ہے کہ گھنٹیوں کی یہ آواز گاڑی بانوں کی تنہائیوں کی رفیق ہے۔ رستوں کی رہبر ہے۔ گیتوں

کی سنگت ہے۔

اوسے یہ آواز گاڑی بان کی نہیں تھی۔ یہ تو بھیا نگا رہے تھے۔ سامان کی بیل گاڑی کی اوٹ میں چھپ کر انھوں نے یہ گیت چھیڑا تھا دھن اودھنے اگلے بھی تھی۔ ہم نے ان کی آواز نہ کی نہیں پہچانی۔

اب پرندے اپنے اپنے آشیانوں سے نکل رہے ہیں۔ رات کی چادر فضا نے بسیط سے کوئی سچ ٹیکوں میں پکڑ کر بڑی نزاکت اور احتیاط سے کھینچ رہا ہے ایک ایک شے آہستہ آہستہ نمودار ہو رہی ہے۔

بانو آپا نے کہانی ادھوری چھوڑ دی ہے۔ اس ادھوری کہانی کو مکمل کرنے کی نہ اس وقت ان کی خواہش ہے اور نہ ہم سب ہی اس پر مائل ہیں۔

بھیا اپنا گھوڑا بھر ہماری بیل گاڑی کے پیچھے آئے ہیں۔ شاید وہ اس موقع کی تاک میں رہتے ہیں کہ ابا اور امی کی نظروں سے نکل کر کسی طرح ہم سے چھیڑ چھا کر گریا۔ ہم سب انھیں پیاتے ہیں۔ لیکن ہماری بیل گاڑی بیلان کی اپنی کوئی اور شے بھی ہے جو شاید انھیں ہم سے زیادہ پیارا ہے۔

آتے ہی انھوں نے ٹسکوریاں سے پوچھا۔

”اے میاں ٹسکو“

”کیسے جی“

”بانو رانی کو ہماری چھٹی پہنچ گئی؟“

”ہاں جی“

”شاباش“

”کہو کیا مانگتے ہو۔“ منی نے ٹنکو میاں کو کچھ آہستہ سے سکھا پڑھا دیا۔

”باذرائی کو مانگتا ہوں بھی“

بھیا بے اختیار سر کا دیے۔ بانو آپا کے تو چھوٹا سا تہقہ نکلی پڑا جو گھنٹیوں کی

طرح سر ملا تھا۔

منی کہنے لگی۔ ”بھیا آؤ آپ بانو آپا کو لے کر کیا کریں گے“

بھیا نے کہا۔ ”دھن بناؤں گا۔۔۔ پھر باذرائی کو نوکرا بھر کے بچے ہوں گے۔

”ٹیس، پیس، اوں ٹوں۔۔۔ ایشٹ“

”یہ کیا بات ہوئی بھیا۔“ ٹنکو میاں نے پوچھا۔

بھیا کہنے لگے۔ ”پہلا بچہ کہنے گا ٹیس“

”دوسرا کہنے گا۔۔۔ پیس“

”تیسرا کہنے گا۔۔۔ ٹوں“

”چوتھا کہنے گا۔۔۔ اوں“

”ادرم ہم انھیں ڈرانے کے لیے کہیں گے ایشٹ“

”پھر کیا ہو گا بھیا“ منی پوچھ بیٹھی۔

”پھر یہ ہو گا کہ یہ سارے بچے دوڑ کر باذرائی کی گود میں جا دیں گے۔

باذرائی بچوں سے جب یہ سنیں گی کہ ہم غصے میں ہیں تو وہ بھی ڈر جائے گی۔ اور جب

ہم اس کے پاس پہنچیں گے تو وہ مارے خوف کے اس طرح سلام کرے گی۔“

اور بھیا لگے گھوڑے پر سے جھک جھک کر سلام کرنے، بالکل اسی طرح جیسے

پارات کے وقت دوہا میاں کرتے ہیں۔

بانو آپا دوپٹہ مسخر پر رکھ کر تہستی رہیں۔

منگو میاں تالیاں بجانے لگے۔

سنی شاداں و فرحان اس طرح مطمئن ہو گئی جیسے اس کو اچھی طرح سمجھ میں آ گیا ہو کہ بھیا کے لیے بانو آپا کا ایک مصرت یہ بھی تو ہے۔
سامان کی بچھنی پیل گاڑی کے ہیں بدن کہ راستے سے ہٹ گئے تو بھیا نے جھٹ سے لگام ڈھیلی کی اور کہیں اوٹ میں ہم سے جا چھپے۔

— منزل —

رات نے بہت ساری چیزوں کو چھپا رکھا تھا تو ہم نے بھی اپنی نظروں کی حفاظت کی تھی کہ وہ رات کی تنہائیوں میں ادھر ادھر بھٹکیں اور بانو آپا سے کہانی کی فرمائش کی گئی تھی اور اس طرح فیض کی کھڑکیاں بند کر کے کافوں کے درپے کھول دیے گئے تھے۔ رات کا بڑا حصہ اپنے گرد و پیش سے بے خبر ہو کر ہم نے سبز پری اور شہزادہ گلغام کے وطن کے شاداب مرغزاروں اور بے آب و گیاہ صحراؤں میں گزرا تھا۔ لیکن اب فطرت نے آنکھوں کیلئے نظارے فراہم کر دیے ہیں تو ہم نے بھی اپنی آنکھوں کو ہتھیلیوں سے مل کر تیار کر لیا ہے۔ ہر شے ہمیں نہ صرف دعوتِ نظارہ دے رہی ہے بلکہ ہمیں چھیڑ رہی ہے، سلام کر رہی ہے۔

ہو سکتا ہے کہ یہ ہماری عمروں کا تقاضا ہو کہ ہر شے ہمیں چھیڑتی ہوئی خصوصاً زور دیتی ہے یا پھر سبز پری اور گلغام شہزادے کے سحر زدہ ماحول سے بازگشت اس کا سبب ہو یا پھر اس کا کوئی سبب ہو ہی نہیں۔ اس لیے کہ

پڑھتی ہے تو کوئی ایسی چیز جنم لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے جس کا زندگی سے بڑا
گہرا تعلق ہے۔ اور یقیناً خاطر بھی تو آدمی کو یہ یاد کر سکتا ہے، اس کا سنا ہے،
ابھار سکتا ہے۔

بہر حال بانو آپا نے کہانی اور دھوری چھوڑ دی تھی۔ بھیا ہمیں کبھی نظر
آتے تھے، کبھی میں گاڑیوں کی اورٹ میں یا گھر کے سواروں کی آڑ میں چھپ جاتے
تھے۔ یا کبھی سامنے آ جاتے تھے تو ہم انہیں دیکھ نہیں رہے ہوتے۔ بانو آپا البتہ
سارے جہاں سے بے نیاز نہ ہو کر صرف انہیں کو دیکھ رہی ہوں گی۔ لیکن ان کی
نظریں اب بھی پٹی ہیں، پھر بھی ان کی نیچی نظروں کا کیا ٹھکانا۔

وہ جو سامنے آموں اور ناروں کے بھاڑوں کا جھنڈ ہے۔ وہاں ایک
بادلی بھی ہے اور رہٹ چل رہا ہے۔ یہ رہٹ ہم سے اتنا قریب ہے کہ گھر
پیسے ڈول سے پانی کے بادلی میں دایسے لگنے کی دلکش آواز بھی ہمیں سنائی
دے رہا ہے۔ جی تو یہ چاہتا ہے کہ منٹ بھر کے لیے ہی سہی اس باغچے میں
گھر جائیں۔ سمجھ رہا تھا یہیں دھوئے جائیں۔ ناشتہ یہیں کیا جائے لیکن یہ تجھ ز
آپا کے سامنے کبھی کس طرح جاسکتی ہے۔

بہم نے بانو آپا سے شورہ کیا ہے، انہوں نے کچھ پس پیش کے بعد بھیا
کے ذریعہ ابا کو آمادہ کرنے کا وعدہ کر لیا ہے لیکن بھیا دکھائی نہیں دے رہے
ہیں۔ ہم نے آگے کے گاڑی بان سے کہہ دیا ہے کہ وہ گھر کے سواروں کے ساتھ ہوں
تو انہیں یہاں بھجوا دے۔ لیکن وہ وہاں نہیں ہیں۔ آموں کے اس جھنڈ کے نشیب
میں ایک ٹالاب کھائی دے رہا ہے۔ تالاب کے کنارے کچھ بگلے بیٹھے ہوئے ہیں۔

کچھ اڑنے کے لیے پر تول رہے ہیں۔ جنگلی بھینس اور مرغیاں تیرتی پھر رہی ہیں۔ سورج اب اپنی نرم نرم کرنیں زمین پر پھیلا کر رہا ہے۔ تالاب کا پانی اور پرندوں کے پر چمک اٹھتے ہیں۔ تالاب کے تینوں جانب دھان کے کھمبے کھیت ہیں۔ کھیتوں میں کچھ ہی ذرا جھلے پر دو آدمی بے حس و حرکت کھڑے ہیں۔ یہ آدمی نہیں ہیں۔ آدمیوں کا سواٹنگ ہیں۔ پرندوں کو ڈرانے کے لیے کسانوں نے بانس یا لکڑی کی ٹریں سجائیں بنا کر ان پر پھٹے پائے لٹا دیے اور چھوٹے ڈال رکھے ہیں اور ان کے اوپر ہی سروں پر آکھریے اور عواو یہ کئے گئے ہیں۔

ایک ایک بندہ وق چھنے کی آواز دے رہا ہے تو یہ اپنی طرف کر لی ہے۔
 باؤ آپا کہیں کھوئی ہوئی بھینس۔ وہ ایک ایک سوتے سے جاگ پڑی
 ہیں اور اسی آواز کی جانب دیکھ رہی ہیں۔

بھینس تالاب پر دو چار سکندڑوں کی گرجاں اب بھی سن کر گئی ہیں۔ ایک آدمی
 کنارے پر اپنی بندہ وق لپیٹ کر کہتا ہے کہ تالاب میں کچھ لگا رہا ہے۔ یہ آدمی ایک
 اب نظر آیا ہے۔ جانے وہ اب تک کہاں چھپا ہوا تھا۔

”تھا لے بھیا کہاں ہیں؟“ یہ باؤ آپا کی آواز ہے لیکن وہ اس
 قدر آہستہ چوچھ رہا ہے جیسے خود اپنے آپ سے بند چھ رہا ہوں۔

لیکن ہم میں سے کسی نے ان کا جواب نہیں دیا۔ ہم خوبیت کے عالم میں
 ایک عجوبہ دیکھ رہے ہیں۔ ایک انہونی بات ہمارے سامنے ہو رہی ہے۔ اندر ہم
 حیران و ششدر ہیں۔ ہمیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا ہے۔ ایک درخت
 جل رہا ہے ہر ابھر اسے سبز و شاداب و درخت تالاب کے کنارے کنارے

طراف درختوں کی شاخوں پر اداں اور ہرے ہرے پتے بانڈھ رکھے ہیں۔
 صدف سانس لینے کے لیے ناک اور دیکھنے کے لیے آنکھیں پتوں سے ڈھکی ہوئی نہیں
 ہیں۔ اس کا سر بھی پتوں سے ڈھکا ہوا ہے۔ قنبر علی نے یہ بھی بتایا کہ یہ درخت آ
 آہستہ آہستہ تالاب میں گھٹنوں گھٹنوں پانی تک اتر جائے گا۔ پھر وہ فیر کرے گا
 کوئی بٹیا مرغانی گرے گی تو اس شکاری کا کوئی ساتھی چلانگ لگا کر تالا
 ب میں کود پڑے گا اور بٹیا کے برے آگے گا۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے ہم نے بٹوں کو
 گیسٹے ہوئے دیکھا بھی تو تھا۔

بانو آپا سب کچھ سن رہی ہیں۔ لیکن ان کی آنکھیں کسی کو تلاش کر رہی ہیں
 قنبر علی اور پتہ نہیں کیا کیا انکشافات کرتا لیکن بانو آپا یہ پوچھتی ہیں۔
 چھوٹے صاحب۔ گھوڑے پر کہیں گئے ہیں کیا؟

”ہاں بی بی۔ وہ تالاب ہی کی طرف انھیں شکاریوں کو دیکھنے کے لیے
 گئے تھے۔ کیا ابھی واپس نہیں ہوئے۔“ قنبر علی نے پوچھا۔

”لوٹ آتے تو نظر نہ آتے؟“ بانو آپا کے لیے میں اب بھی وہ نرمی
 نہ ملتی جو ان کی گفتگو کا خاصہ ہے۔

قنبر علی پھر کہنے لگا۔ ”گاؤں اب یہاں سے کوئی ڈیڑھ دو فرلانگ پر
 رہ گیا ہے۔ قنبر میں ہونے کی وجہ سے گھر دکھائی نہیں دے رہے ہیں۔
 میں صاب کی آمد کی اطلاع کر آیا ہوں۔ لوگ سو آگے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ وہ
 باجے اور بھولوں کے بارے کر آ رہے ہیں۔ وہ چھوٹے صاحب کی بھی گپوشی
 کرنا چاہتے ہیں۔“

شکوہیاں اور سنی تالیاں بجانے لگے۔

لو! لو! — مٹی پھولوں میں سماتی ہے — وہ بار بار شکوہیاں سے کہہ رہی ہے۔ تم بڑے سیانے ہو گئے رنگو — تم تو پہلے ہی سے کہہ رہے تھے۔

بالو آپا کا جہرہ باغ دہسار ہو رہا ہے۔ ان کی آنکھیں جگمگنے کی طرح جگمگاتی ہیں۔ ان کے عارض پر گلاب کھل گئے ہیں۔

”میں ذرا چھوٹے صاب کو اس بات کی اطلاع کر دوں۔“ قنبر علی نے گھوڑی کو رینگائی اور ہوا سے باتیں کرتا یاغیچے کی سمت روانہ ہو گیا۔

شاداب گھیتوں کے درمیان سے ہو کر اس کی گھوڑی پگمڈی پر اس قدر تیزی سے جا رہی تھی جیسے میدان میں دوڑ رہی ہو۔

چلتا پھرتا درخت تالاب کے پانی میں واہی اتر گیا ہے۔ اب وہ بالکل خاموش کھڑا ہے۔ ہماری بیل گاڑیاں سیدھی جانب گھومتی ہوئی ذرا فراق پر آگئی ہیں۔ یہاں سے منظر زیادہ دلکش زیادہ واضح ہو گیا ہے۔

چلتا پھرتا درخت جو اب ساکن کھڑا ہوا ہے اس کی بائیں جانب ایک ٹہنی پھوٹ رہی ہے۔ آہستہ آہستہ یہ ٹہنی درخت کے اوپری سہکے پہنچ گئی ہے۔ بلاشبہ یہ بندوق ہے جس کو شکاری نے پتوں میں پھپھایا ہے۔ ہمیں

صرف دھماکہ سنائی دیا ہے اور چلتے پھرتے درخت کے بالکل مقابل ایک آدمی پھلانگ لگا کر تالاب میں بڑی بے جگری سے پانی کا ٹپا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔

قنبر علی کی گھوڑی ذرا سا نشیب میں ہمیں دکھائی دے رہی ہے۔

وہ تو واپس لوٹ رہا ہے۔ ہرے بھرے کھیتوں کے بچوں نے پگڑی بندھی
پر اپنی گھوڑی کو اس طرح سرپٹ دوڑاتا ہوا یہ نوجوان بھومے بھلاتے
کھیتوں میں کیسا بھلائیگ رہا ہے۔

دیکھتے کے دیکھتے وہ ہمارے قافلے کے قریب پہنچ گیا۔

شہر د۔ اس نے قریب قریب چھ کر کہا۔

”جھوٹے صاحب کے سینے میں درد ہے وہ بے ہوش ہو گئے ہیں۔“

پلک جھپکتے ہیں سب گھر سوار قہقہے ہنسی کے نیچے اپنے گھوڑے سرپٹ
دوڑاتے کھیتوں میں گزرتے ہیں۔ ایک گھوڑے پر ابابھی سوار ہیں۔

ہم لوگ سب کے سب ہیں گاڑیوں سے کورڈ بڑے ہیں اور غیب
میں ہی سمت بھاگ رہے ہیں جس طرف گھر سوار گئے ہیں۔ بانو کیا
امی کا لاکھ تھا سب سے آگے آگے آگے ہیں۔

باجوں کی آواز ہمیں صحت سائی دے رہی ہے۔ شاید گاؤں کے
لوگ ہمارے سواگت کو آ رہے ہیں۔

پھر ہمیں جیسے کچھ سمجھائی نہیں دے رہا۔ کچھ سائی نہیں دے رہا ہے
لیکن کوئی کہہ رہا ہے کسی کا حرکت قلب بند ہونے سے — شاید یہ ابابھی
آواز ہے جو ہر شکل ان کے رندھے ہوئے گلے سے نکل سکی ہے۔

ایک در آواز اس آواز کے ساتھ کہیں دوسرے آ رہی ہے۔

بانو میری — بانو میری۔

ٹنگو میاں سے کوئی کہہ رہا ہے کہ بھیا چاند میں گئے ہیں۔

بافو آپا سو سچ نہ ہی ہیں چاند تک پہنچنے والا آدمی، آدمی کے دل تک
 کب پہنچے گا، اس کی زندگی تک کب پہنچے گا۔

میرے ذہن میں بھی مستقبل کا کچھ عجیب و غریب لاشا خاکہ ابھر رہا ہے۔
 یہ کہانی ہے۔ کوئی حقیقت تو ہے نہیں۔۔۔ پھر کسی کہانی کو اس طرح
 غیر متوقع طور پر ختم نہیں ہو جانا چاہیے۔۔۔
 لیکن میں کیا کر دوں بھیا مر گئے ہیں۔

پانی کے چرل

بھم بھم کرتی اوزر جہاں کو دیکھ آئے تو جیسے نیندوں کے خزانے کی گٹھڑی بنا
چپکے سے اس کی نذر کر دیا۔ اس طرح کہ خود اسے بھی خبر نہ ہوئی کہ کسی نے اپنا
سب کچھ تاج دیا ہے لیکن طرہ دار علی خاں کے لیے پھر کوئی شب ایسی نہ ہوئی جس کی
سحر کرنے میں آنکھوں نے موتی نہ ٹھاکے ہوں۔ سب نے دیکھا کہ بوجھیں بیوٹوں کے نیچے
کچھ سرخیاں اس طرح چھپ کر طرہ دار علی خاں کی آنکھوں میں پرچ بس گئی ہیں کہ جیسے
دنیا بھر میں کہیں اور انھیں جگہ ہی نہ ملتی۔

اتنی بڑی جھڑی تو انھیں نہیں کہ بھم بھم کرتی دیکھا اور بڑھ کر گود میں اٹھالیا اور
چپکے خدوت کدے کی زینت بنالی۔ شہر کے راجے آنکھیں کچھا رہے تھے۔
نواب زادوں کی ڈوبیاں ہاتھوں ہاتھ لے رہی تھیں جے یور سے تین ہینس حیدر آباد

ہو بچیں اور جیسے سارے شہر میں غل غپاڑہ مچ گیا۔ بھدر ہو گیا۔

نواب بھکر میاں کی نواب کی میاں سے بڑی بہن کے لیے ایسی ان بن ہوئی کہ بھری انجن میں تلواریں کھینچ گئیں۔ یہ اور بات۔ یہ کہ تلواریں چلیں نہیں اس لیے کہ دونوں ہی صرف تلواریں کھینچنا جانتے تھے۔ چلانے کے لیے پسرے دادوں کی کمی نہ تھی جو یہ معیشتی کام بھی وہی کر لیتے۔ چلو اچھا ہی ہونا۔ در نہ کیا خون خرابہ ہوتے۔ بچپن چپکے سے جوانی کی سرحدوں میں داخل ہوا تو نینوں کے بان اور ابد و دُوں کی کٹ رنے اس بری طرح ٹھانک گیا کہ سب کی تلواریں اپنی اپنی نیام میں ہی دھری دھری نرمک خود رو ہو گئیں۔

لیکن طر حدار علی خاں نے پہلی بار ہی بھری انجن میں پلکیں بھپکائیں تو اتنی چکا چونہ تھی کہ انجن سے اٹھنے اٹھنے تک انھیں ساری دنیا تاریک تاریک سی دیرا ویران سی دکھائی دینے لگی۔ دل کی بستی میں جیسے جراحاتوں نے پڑاؤ ڈال دیا تھا۔ فستروں نے طنائیں کھینچ لی تھیں چپکے چپکے سلگتے رہتا اور ات نہ کرنا۔ دھبی دھبی آج نہ شعلہ بن کر لپکی نہ راکھ کا ڈھیر کا ڈھیر بن کر ٹھنڈی ہوئی۔

کوئی محفل ہو کوئی انجن ہو، دو آنکھیں جھم جھم کرتی اور جہاں کو تک جاتیں۔ محفل پر خواست ہوتی تو گزرنے والے کے دل پر سب کچھ گزرجاتی لیکن انور جہاں کو خبر بھی نہ ہوتی کہ کوئی اس بھری پڑی دنیا میں ان کی بادولت تنہا تنہا ہو کر رہ گیا ہے۔

پھر طر حدار علی خاں کی آنکھوں میں ان کے اپنے آنسو رات رات بھر کنکر بن کر ٹھکنے لگے۔ اور ہر تار بستر خار بستر ہو کر رہ گیا۔

ہوس کی طرح کسی پایاب دریا کے کنارے کنارے چلنا تو اکتھیں تھا
 نہیں وہ تو سرتابہ قدم محبت نہی محبت بن کر ڈوب جانا چاہتے تھے، ہوس اور
 محبت کی نگاہ میں کتنا چھوٹا سا فرق ہوتے ہوئے بھی کتنا بڑا فرق ہے۔ کوئی قافلہ
 نہ ہوتے ہوئے بھی کس قدر فاصلہ ہے۔ یہ بات طر حدار علی قاسم کی نظروں سے
 صاف ظاہر ہو جاتی۔ دوسری بے شمار نظریں تو انور جہاں کو محفل میں کڑی کے
 جاں کی طرح اپنے تالیے بانے میں محصور کر لیتیں لیکن طر حدار علی قاسم کی نظر کچھ
 اس طرح پھیلتی جاتی تھی جیسے اس نظر سے انور جہاں کو کچھ ناسی مرد کے پس
 میں ہی نہ ہو۔ جیسے لوہے کے زنگ خوردہ تاروں کے گچھے میں چاندی کا شفا
 تار بھی اچھ کر رہ گیا ہو۔

ایک بار ایک محفل سے انور جہاں بھر ادا سے گر لوٹ رہی تھیں سنا نہ رہے
 طلبہ، ستار اور سارنگ، گچی میں رکھ کر انور جہاں کے منتظر تھے۔ وہ محفل سے
 اٹھ کر گچی تک پہنچنے کے لیے پچانک کی طرف بڑھیں تو دالان اور پیش دالان
 سے ہو کر اکتھیں صحن سے گزرنے لگا۔ صحن سے ہو کر جب وہ ایک در دالان میں داخل
 ہوئیں، تو ذہن تو انداز کے بھرے سے ہو کر اکتھیں گزرنے لگا، کیونکہ پردہ کی گواہی
 مرست ہو رہی تھی اور اس طرح باہر نکلنے کا اصلی راستہ بند تھا جب وہ بھر سے
 پہنچیں تو دواں جیسے ڈیوڑھی بھر کے اجالے سسک سسک کر دم توڑ رہے تھے۔
 کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہی حجرہ ساری ڈیوڑھی کا مستقبل ہے جہاں ذہن و اند
 کی نشست کے لیے چٹائی بچھی ہوئی تھیں۔

انور جہاں نے ادھر حجرے میں قدم رکھا ادھر کوئی چپکے سے بڑھ کر ان کے

مقابل آگیا۔ وہ بھییں کہ بے کوئی عاشق مزاج جو اس طرح پھیڑ پھیا ڈکڑا رہا ہے۔ لیکن یہاں تو فتنہ ہی بدلا ہوا تھا۔ دیکھتے دیکھتے ایک اچھا خاصا مرد اور جہاں کے آگے دوڑاؤ ہو گیا۔ اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کے قدم پکڑ لیے اور سر جھکا کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اور جہاں ہر جگہ کے لیے تیار تھیں۔ انھیں سر دیکھنا ہیوں سے تڑپ کر نکل جانا تو آتا تھا۔ وہ یہ تو جانتی تھیں کہ طاقت ور سے طاقت ور بڑا تھنا شائستگی کا مظاہرہ کریں تو کس بیوردی سے وہ بڑا تھنا جھٹکا دینے سے جاسکتے ہیں کہ پھر کسی حرکت کی جرات ہی نہ ہو۔ لیکن اس حملے سے کس طرح بچ بچنا چاہیے، اور جہاں نے کچھ نہ سوچا تھا۔ نہ کسی نے سکیا یہی تھا۔ طرحدار علی خاں کے آفسیو تھے کہ اس قدروں کو ہنگوڑے بنے تھے اور جہاں پر بھیجے سکتے کا غامطاری تھا۔ وہ نہ کچھ پوچھ سکتی تھیں نہ جھاک کر طرحدار علی خاں کو اپنے قدموں سے اٹھا سکتی تھیں۔ بوکھلا بیٹ ہیں آخر کار انھوں نے جھاک کر اٹھانا چاہا تو ہاتھوں کا سہارا پایا کر طرحدار علی خاں نے اور جہاں کے بڑا تھنا م لیے اور ان کو آنکھوں سے مل کر آنسوؤں سے تر کر دیا۔

بر وقت تمام اور جہاں نے پوچھا کہ آپ کیا چاہتے ہیں اس قدر دل گیر کیوں ہیں۔ طرحدار علی خاں جواباً اتنا کہہ سکے کہ مجھے میری زندگی دے دو جو پہلی نظر ہی میں میں نے تمھارے قدموں میں ڈال دی ہے۔ زہرہ میں مرجاؤں گا، میں تمھارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔

اور جہاں کے ذہن میں مرنے والوں کی بڑی لمبی چوڑی سی فہرست محفوظ تھی۔ لیکن یہ نہیں انھوں نے طرحدار علی خاں کا نام اس فہرست میں کیوں شامل

نہیں کیا۔ کہنے لگیں، آپ میرے گھر تشریف لائیں، مجھے آپ سے مل کر خوشی ہوگی اور ایک گھپا کے سے حجرے کو پار کر کے باہر نکل گئیں۔

اندھیرے میں انھوں نے ٹھیک سے دیکھا بھی نہ تھا کہ یہ کون فوجوان ہے جو اس طرح گر کر مارا رہے گا۔ پہنچ کر انھوں نے گھوم کر دیکھا تو حصار علی خاں بھی اس طرح صدمہ رہے تھے جیسے بچہ کھلوان کو تکتا ہے اور واقعی حصار علی خاں تھے بھی حصار۔

انور جہاں کو کوئی محرمی نہیں ہوئی اور بھگی تڑپڑ کرتے آگے بڑھ گئی۔ حصار علی خاں ایک نئیں ہزار بار انور جہاں کے گھر گئے۔ پاؤں سے نہیں سر سے چل کر۔ اور پھر ایک بار ایسے گئے کہ بس اندھیر ہی کے ہو رہے۔ وہ چلتی پھرتی تو آپ آنکھیں پچھاتے۔ وہ بیٹھی گلوریاں بناتی رہتیں تو آپ سو سو طرح شمار ہوتے رہتے۔ وہ سو جاتیں تو بس بیٹھے چپ چاپ تھا کرتے۔ پھر یکایک پیرزں پر آنکھیں ملنے لگتے۔ وہ پیر سمیٹ لیتیں تو خوش ہو کر آنکھوں میں لے لیتے۔

پھر چپکے چپکے نکاح کے دو بول کے بدلے میں انور جہاں بالکل حصار علی خاں کی جالیم بن گئیں۔ وہ انھیں اب جالیم کہہ کر پکارتے۔ انور جہاں کچھ اس طرح حصار علی خاں سے وابستہ ہوئیں کہ دیکھنے والے بلا کسی لاد پٹیٹ کے کہہ اٹھتے کہ انور جہاں بنی ہی اس واسطے تھیں کہ کسی ایک کی ہو کر رہیں کسی ایک دل میں سکون اور اطمینان سے بس اس طرح براہیں کہ انھیں دنیا کی کچھ خبر ہی نہ ہو۔ اور ہوا بھی ہی۔ وہ حصار علی خاں میں کھو گئیں اور حصار علی خاں ان میں کھو گئے۔

لیکن ہم سے پہلے ہی بہت سے لوگ لکھ گئے ہیں کہ محبت اس دنیا میں پر دان

نہیں چڑھ سکتی۔ چنانچہ انور جہاں کے چھوٹے سے کنبے میں وہ ادھم مچا۔ وہ ہنگامے ہوئے
وہ وہ فتنے کھڑے ہوئے کہ الحفیظ والامان۔

بات کچھ اتنی غیر اہم بھی تو نہ تھی جو بالکل ہی نظر انداز کر دی جاتی۔ اپنا وطن
چھوڑ کر گھر بار پھونک کر جے پور سے حیدر آباد کو اس کنبے نے ہجرت کی تھی۔
کیا کیا سوچا تھا کہ زندگی کی بہاریں اپنی ہی چہار دیواری میں مقید ہو کر رہ
جائیں گی۔ ایک نہیں دو نہیں۔ تین بہنیں تھیں۔ پھر تینوں بھی ایسی کہ ایک پر
دوسرے کو ترجیح دینا بجائے خود بار ایک بیٹی کے فن کا کمال تھا۔ اب گھر
والے اگر اس طرح سوچیں کہ جے پور سے حسن کی ساری دولت سمیٹ کر ان کا
قافلہ سوداگری کرنے حیدر آباد جیسے متمول شہر میں آن بسا تھا کہ ایک دولت کا
دوسری دولت سے تبادلاً ہی تو ہو گا۔ لیکن یہاں آ کر اپنی پونجی جیسے کنکالوں کے
باکھوں لٹ گئی۔ کچھ باقی رہ گئی تھی سو اس کا بھی کچھ ٹھیک نہیں تھا۔ پتہ نہیں
کہ کون کس کے گھر بیٹھ جائے۔ یوں گھر بیٹھا ہی اگر زندگی کا مقصد تھا تو کون
اپنا پیٹ کاٹ کر تان سر کے فن پر سب کچھ بچھا کر کرتا۔ بھی آس تو یہی تھی تاکہ
تینوں کی تینوں ہندوستان بھر میں نام پیدا کریں گی۔ انگریزوں نے صورت دی
تھی، گلا دیا تھا۔ بالی جی نے اپنا سارا اثاثہ پھونک کر کوئی کسر اٹھانہ رکھی تھی۔
سارے کا سارا فن جیسے گھول کر تینوں بہنوں کو اپنے ہاتھ سے بالی جی نے اس طرح
پلا لیا تھا کہ ایک قطرہ بھی ضائع نہ ہو۔ ادھر حیدر آباد پہنچ کر ابھی پر پرے
نکالے بھی نہ تھے کہ انور جہاں، طرہ دار علی خاں کی ہو کر رہ گئیں، بالی جی کو زما
نے پر کھا تھا، بدلتا تھا، بالکل اس طرح جس طرح بالی جی نے خود زمانے کو

پر کھاتھا اور برتا تھا۔۔۔ طر حدار علی خاں کے عشق کا نالٹک ظاہر ہے انہیں
ایک آنکھ نہ بھایا۔۔۔ صاحبزادے لٹو ہو گئے رکھتے تو کوئی مضائقہ نہ تھا
۔۔۔ گھر بھونک کر دنیا میں نام کرتے اور اس طرح تو بانی ججی کی بن آتی۔
لیکن یہاں تو لیل و نہار ہی دوسرے تھے، شام و سحر ہی بے ڈھب تھے۔
نہ ہینگ لگی تھی نہ پھنگری اور طر حدار علی خاں کے عشق کا جادو تھا کہ انہوں
کے سر پر ٹھ کر بولنے لگا تھا۔

کدھر سنہ مری، مٹی کی گرٹیا جیسی لڑکی اب گز گز بھر کی زبان نکال کر
دو ٹوک باتیں کرتی۔ دنیا بھر کی مسجدوں کے ملا۔ نے مر گئے رکھتے اور سبھوں نے
دیران مسجدوں کی جانا زیں سمیٹ کر انور جہاں کے حوالے کی تھیں جو وہ با
بے بات کے مصلے اچھا کر بیٹھ جاتیں۔ دونوں ہاتھ اور پر اکٹھا کر پھت کو
تکتیں، پھر ٹپ ٹپ دو چار آنسو گرتے ہوئے ٹوٹتے تاروں کی مانند
سارے جاک کی آنکھوں کو دکھائی دیتے۔ رہ گئیں دعائیں، ان کے قبول
ہونے نہ ہونے کی بات تو سانچا بادشاہ ہی جانتے۔

بانی ججی نے سو سو طرح سے فتنے اٹھائے، ہنگامے کھڑے کیے۔ کوئی تذکرہ
نہ پھوڑی کہ انور جہاں، طر حدار علی خاں کے چنگل سے نکل سکے۔ لیکن خدا
معلوم ان کھوڑے سے دونوں کی یک جالی میں طر حدار علی خاں نے کیا کیا
سبق پڑھایا تھا کہ انور جہاں صاف صاف کہہ اٹھتیں کہ میں باز آئی اس
زندگی سے جس کا راستہ سیدھے جہنم کو جاتا ہے۔

اور بانی ججی جیسے انور جہاں کو سیدھے جہنم کو لے جانے پر تلی بیٹھی تھیں۔

وہ بڑی گراوٹ پر اتر آئی تھیں کہنے لگیں پہلی بار جس خصم کی آغوش گرمائی تھی وہ تو نہ ہوا سب کچھ تیرا۔ کہتی تھی میں کسی پھرے کا بچھی نہیں ہوں جو اپنے کچش کاٹ کر بیٹھ رہوں۔ میری کلا، میرا فن کیا سب کچھ ان کے ساتھ ہی بیٹھ رہے گا۔ اور اب اس باوے لونڈے کے پیچھے اس طرح دیوانی ہوئی ہے کہ بات شروع ہو تو ساپنے بادشاہ کی دہائی سے اور بات ختم ہو تو ساپنے بادشاہ کی دہائی پر۔ اور وہ بھی مت مارا، مجھوں کی اولاد، دروازہ بند کر لیتے ہیں تو رات رات بھر چوکھٹ پر بیٹھا گزار دیتا ہے۔

یہ ایک انور جہاں شیرنی بن کر بھر گئی۔ سب کے سب حیران حیران سے ٹکڑ ٹکڑ دیکھتے رہ گئے۔ قدم پکڑ کر سسکنے والی لونڈیا، آن کی آن میں زحی شیرنی کی طرح دھاڑ رہی تھی۔

کہہ رہی تھی۔ بوٹیاں پچھو اور ہماری۔ مرد اگر کسی کھڑ میں پھینک دو۔ وہ تو اس کی شرافت ہے جو دروازہ بند کر لینے پر بھی رات رات بھر چپ چاپ چوکھٹ پکڑ کر گزار دیتا ہے۔ سن رکھو وہ میرا کوئی ہوتا سوتا نہیں ہے۔ وہ میرا شوہر ہے۔ میں نے عقد کیا ہے اس سے وہ جس وقت چاہے میرا ہاتھ تھام کر اس چار دیواری سے مجھے نکال سکتا ہے، جہاں میرا دم کھٹ رہا ہے۔

طرحدار علی خاں کو جانم کا اس ماحول میں سانس لینا ایک لمحہ نہ بھاتا تھا۔ وہ تو صرف اپنی جانم کی خاطر کھٹی وہ بالی جی کو راضی کر لیں گی تو تمہنی خوشی و دواع ہوں گے۔ اس نیک ساعت کے منتظر تھے جب کہ جانم ان کے

چھوٹے سے گھر میں منتقل ہو جائیں گی جو انھوں نے اپنے ماں باپ کی چوری چھپے کر لئے پرے رکھا تھا۔

لیکن یہ سب کچھ نہ ہو سکا۔ بائی گھاٹ کا پتھر ٹھیس۔ طوفانوں نے اپنا سر پھوڑ لیا لیکن وہ نہ ملیں۔

طوفانوں نے خود ہی اپنا رخ بدل لیا۔ اور اس طرح رات کے اندھیرے میں انور جہاں جہنم جہنم کے لیے طرحدار علی خاں کی ہو گئی تھیں۔
اپنی دولت جب اس طرح شہر میں برسر عام لٹنے لگی تو بانی جی کے لیے اپنے بچے ہوئے اثاثے کے لاسے پڑ گئے۔

یہاں کے فواب زادوں کے چنگن بانی جی کو دنیا بھر سے کچھ مختلف ہی نظر آئے۔ جن کے پاس دولت ہوتی وہ بے دریغ لٹا دے بھی۔ لیکن ایسے تھے کتنے بھی جنھیں انگلیوں پر گن لیا جاسکے۔ دوسرے تھے تو عشق جیسے ٹھنڈے درختوں میں ملا تھا۔ کیو پڈ کا دیوتا جیسے ان کے خانہ دل کا پاس بان تھا ایسا شاید عشق کرتے کہ مجنوں بے چارہ اس وقت زندہ ہوتا تو شاید اس کا سارا گیا گرایا مٹی میں مل جاتا۔ اتنے دن کی شہرت، عزت و ناموس دیکھتے دیکھتے جہنم داخل ہو جاتی۔
انور جہاں جب اتنی آسانی سے طرحدار علی خاں کی ہو رہیں تو دنیا کی ساری محبتوں پر سے بانی جی کا ایمان اٹھ گیا۔ وہ جس کو سینے سے لگا کر سلایا، وہ جس کو پھاتیاں چوکر دودھ پلایا۔ وہ جس کے لیے زندگی کا سکہ چین لٹا دیا۔ وہ جس کی آنکھ نہ بھپکی تو اپنی راتیں تصدیق کر دیں۔ وہ جس کو۔ وہ جس کو۔ وہ جس کو۔
اور یادوں کا ایک سلسلہ ان کے ذہن سے گزر کر ان کی آنکھوں کے آگے مجسم

ہوتا ہوا بس آنسو بن کر آنکھوں سے ڈھل گیا۔

یہ آنسو بانی جی تمہارا مقدر بن سکتے ہیں۔ یہ آنسو بانی جی تمہارا مقدر بن سکتے ہیں۔ کوئی تمہا جو مسلسل بانی جی کے کانوں پر اپنے ہونٹ رکھ کر چلا رہا تھا۔ یہ آنسو بانی جی تمہارا — تم یہاں سے چلی جاؤ۔ تم یہاں سے بھاگ جاؤ۔

اپنی بچی بچی دولت لے کر لوٹ جانا چاہیے — اپنی دونوں بیٹیوں کو لیکر واپس ہو جانا چاہیے۔ کوئی ہتھوڑے سے ذہن پر چلا رہا تھا اور بانی جی نے طے کر لیا کہ کئی دن سے یہ جو آ رہے سے دل پر چل رہے ہیں۔ انھیں اپنی گرفت میں مضبوطی سے تھام کر بیچ سڑک پر اس طرح پھینکے گی کہ اس شہر کی ہر ماں کا دل گھائل ہو جائے۔

چھوٹی بٹیا کو راجہ صاحب نے آج پھر مجرے کے لیے بلایا تھا۔ بانی جی سُن چکی تھیں کہ وہ چھوٹی بٹیا کے بغیر چل بھر چین سے نہیں گزار سکتے تھے۔ مجرے کا بیٹا لوٹاتے ہوئے بانی جی نے کہا — داروغہ جی راجہ صاحب سے کہہ دینا۔ وہ جو بیچتے تھے وہ آئے دل — وہ دکان اپنی بڑھا گئے۔

لیکن چھوٹی بٹیا نے بڑھ کر داروغہ جی کو آواز دی — ”کہہ دینا میں رہی ہوں“ بانی جی نے چھوٹی بٹیا کو اس انداز سے دیکھا جیسے پوچھ رہی ہوں — بٹیا تمہارے دل کے کسی کونے میں کہیں تمہاری ماں بھی تو رہتی ہو گی؟ — اسے ڈھونڈ نکالو، اسے ڈھونڈ کر نکالو۔

لیکن چھوٹی بٹیا نے بانی جی کو نظر بھر کر دیکھا بھی نہیں۔

چھوٹی بٹیا جانے کی تیاری کرنے لگی تو — بانی جی نے سوچا —
 دھڑا دھڑا اپنا گھر چلتا رہے تو قہقہہ لگانے میں کتنا مزہ آتا ہوگا۔
 لیکن اس سے پہلے کہ وہ قہقہہ مار کر ہنس سکتیں کسی نے ان کے قدم کپڑے۔
 بانی جی جلتے ہوئے گھر کا سماں آنکھیں میں لیے خیالوں ہی خیالوں میں
 کہیں دوڑ جا چکی تھیں۔ پتہ تک نہ چلا کہ کون در آیا اور کس نے قدم تھام لیے۔
 انور جہاں کی سرکشی کے خلاص بانی جی نے اپنے ترکش کا کوئی تیرا کھٹا
 نہ رکھا تھا جو سر نہ نش نہ کر سکے۔

لیکن جب بارہ ہونی ہے تو بانی جی جیسے اس طرح لٹ لٹا گئیں کہ غصہ
 کرنے کی جرات بھی ان سے کسی نے پھین لی۔ اور اب بٹیا پر پڑے نکالنے
 لگی تھی تو بانی جی میں ہمت ہی نہ تھی کہ قہقہے لے کر بال و پر کتر دیتیں۔
 اب تو کوئی آنہیں کی غنچا دی کرے تو کرے۔ کوئی انہیں پر ترس کھائے تو کھائے۔
 بانی جی نے تڑپ کر جو گردن جھکائی تو انور جہاں قدموں میں سسک رہی تھی۔
 ”ماں۔ میں آگئی ہوں۔“
 ”ماں۔ میں آگئی ہوں۔“

بانی جی دیوانوں کی طرح انور جہاں کو گتتی رہیں۔ بدقت انہوں نے پوچھا۔
 ”طرح دار میاں کہاں ہیں انور؟“

”میں کچھ نہیں جانتی ماں، مجھے کچھ نہیں معلوم۔ میں ان کا انتظار کرتی
 رہی۔ میں ان کا انتظار زندگی بھر کر سکتی تھی۔ مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں کہ
 وہ لٹے ہوئے جاگیر دار ہیں۔ وہ چاہتے کچھ ہوں ماں، میرے پیٹ میں میرے

لیٹ میں۔ اور انہیں اس سے بھی تو محبت نہ ہو سکی۔ جوان کا بھی۔۔۔ جوان کا بھی خون ہے۔

بائی بچی نے انور کو اکٹھا کر سینے سے لگا لیا۔

”میں کہیں نہیں جاؤں گی بیٹی۔ میں اب کہیں نہیں جاؤں گی۔ میں اس شہر سے چلی جانا چاہتی تھی۔ لیکن میری حیرت ہو گئی ہے۔ میں سمجھتی تھی کہ اس دنیا میں کوئی چیز سچی نہیں ہے۔ صرف آنسو سچے ہیں۔ وہ چراغ نہیں بجھتے جو بھسکی ہوئی آنکھوں میں جلتے ہیں۔ اور طرح دار میاں کے کہیں چراغوں نے تیری زندگی میں روشنی ہی روشنی بھری تھی۔ ایسی روشنی جس کے آگے میرے گناہ کا نپ کانپ جاتے تھے لیکن وہ سارے چراغ بجھ گئے ہیں۔“

انور نے نظر اٹھائی تو اسے کھونٹی پر اپنی جاننا زادہ تسبیح نظر آئی جن کا طرح دار میاں کی ہو رہنے کے بعد اس نے سہارا لیا تھا۔

اس نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”ماں جھاڑ پونچھ کر کہیں کسی مسجد میں بھجوا دو۔“

اور بڑے انداز سے بڑھ کر اس نے فرش پر پڑے ہوئے پائل اٹھالے۔

ساحی

میں نے جب ان کا خط کھولا تو کتاب کی پنکھڑیاں میرے قدموں میں گھومتیں۔
اور یہ پنکھڑیاں ساحرہ نے چن لیں۔

میرا کتنا جی چاہا کہ بھک کر ایک ایک پنکھڑی چن لوں۔ لیکن یہ مجھ سے نہ ہوا۔
شرم واسن گیر تھی۔ میں نے ان کا خط بھی تو نہیں پڑھا بس القاب پر نظر ڈال کر
بسی سرخ ہوا اٹھی اور اپنے بلوز میں اس کو پلو برابر کر لیا۔

پنکھڑیاں چن کر ساحرہ نے مجھے دینی نہیں بلکہ نہایت ہی احتیاط سے انھیں
پلو میں باندھ لیا۔ مجھے یہ حرکت کچھ اچھی نہیں لگی۔ میں تو سمجھی ہوئی تھی کہ
دہ چپکے سے میرے ہاتھ پر رکھ دے گی اور میں مٹھی میں دنیا بھر کی نظروں سے ان
پنکھڑیوں کو چھپا لوں گی یہاں تک کہ ساحرہ کی نظروں سے بچی۔

قد وانی کا جٹ کے کج کج میں لوگ موتیوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے میں نے موتیوں کی مثال اس لیے دی ہے کہ سب کے سب سفید لباس میں ملبوس تھے۔ اور اس لیے بھی کہ ہم گیسٹ میں داخل ہونے کے بعد موٹروں کی پارکنگ کے حصے سے نشیب پٹن میں جانا چاہیں تو ہمیں ان سیڑھیوں سے ہو کر گزرنی پڑتا ہے جو بلندی سے دو شاخوں میں بھینسی شکل میں بدل گئی ہیں، اور نشیب چمن میں پھر مل گئی ہیں ہم سبھوں نے موٹروں سے اترتے ہی انھیں سیڑھیوں کا رخ کیا تھا۔ میں اپنی مرضی سے سبکے پیچھے رہ گئی اور بلند یوں پر کھڑے کھڑے اس خوبصورت سے اجلے اجلے سفید سفید قافلے کا نظارہ کیا جو ان بھینسی سیڑھیوں پر موتی کی مالا بن گیا تھا۔ اور یہ مالا نشیب میں پہنچ کر ٹوٹ رہی تھی اور اس کے موتی دانہ دانہ ہو کر بکھر رہے تھے۔ علیم نے مڑ مڑ کر کسی بار مجھ دیکھنے کی کوشش بھی کی لیکن میں ان کی نظروں سے چھپ کر انھیں دیکھ رہی تھی۔

دو آنکھیں بھری پوری محفل میں کسی کو تلاش کر رہی ہوں، مضطرب بے قرار، بے کل لیکن پچھے چوری — اور وہ دو آنکھیں جن کی تلاش ہو رہی ہے۔ چمن کے کسی محفوظ گوشے میں پھولوں کے بیچ چھپ کر ان پیاسی آنکھوں کی بے قراری کا منظر دیکھ رہی ہوں جو متلاشی ہیں — تو دل دنیا بھر کی کتنی ہی دلتیں پالیتا ہے۔

اور میں انہی دلتوں سے مالا مال تھی —

علیم کی نظروں سے چھپ کر علیم کو دیکھتے رہنے میں میرے لیے کیا کچھ نہ تھا میری اپنی آنکھوں کے لیے ٹھنڈک بھی تھی۔ علیم کی عزائی آنکھوں کی بے قراری کا سماں بکھڑا تھا۔

اور علیم نے میری اسی آنکھ چوٹی سے تنگ آ کر مجھے یہ خط لکھا تھا جو اس نے ساحرہ کے ہاتھ مجھے بکھجوا یا تھا۔

اور میں کسی محفوظ کج کی تلاش میں غوم رہی تھی تاکہ سب کی نظروں سے چھپ کر علیم کے خط کے لفظوں کو اپنی آنکھوں میں اتار لوں۔

مجھے پھر بکھری ہوئی پنکھڑوں کا خیال آیا جو ساحرہ نے جن کی تھیں۔
اور میں پھولوں کے اس جھنڈ کی طرف چل پڑی جہاں رنگ برنگے پھول
سکرا رہے تھے۔ پھولوں کے جھنڈ کی اس ادٹ نے مجھے پناہ دی میں نے خط
کھولا۔ علیم نے لکھا تھا۔

ردھی..... میری زندگی

میں نے جن میں قدم رکھتے ہی تمھارے لیے یہ پھول کسی کو مل سکی
ایک شاخ سے جدا کر لیا تھا کہ اسے تمھاری زلفوں کی لمبی سیاہ
رات کا چمک دار ستارہ بنادوں۔ لیکن تم تک میری رسائی کہاں
جب کہ تم خود مجھ سے گھپتی رہی ہو۔

اس پھول کے مقدر میں تو پنکھڑی پنکھڑی ہو جانا تھا۔ سو
میں نے بے دردی سے اسے فوج دیا ہے۔ اب تم اتنا ہی کرد
کہ ان پنکھڑیوں کو بکھرنے نہ دو۔

تمھارا علیم

اور پنکھڑیاں نہ صرف یہ کہ کھری تھیں بلکہ ساحرہ کے ہاتھوں نے انھیں میرے قدموں
میں سے جن لیا تھا۔ میں تڑپ کر رہ گئی۔ میں نے خط پڑھا۔ اور میری

زلفوں کی لمبی سیاہ رات بغیر کسی تارے کے ویران سی رہ گئی۔

جب میں پھولوں کے جھنڈے سے نکل کر سب میں آئی تو۔ علیم نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے نظروں ہی نظروں میں پیار کر رہے ہوں۔ تماش کھیلنے ہوئے ان کی نظریں تماش پر نہیں تھکتیں۔

لیکن اب میرے دل و دماغ پر علیم نہیں ساحرہ چھا چکی تھی میری نظریں اس کو تلاش کر رہی تھیں۔ وہ کہیں نہیں تھی۔

یہ ایک وہ مجھے نظر آئی۔ علیم ہی کے پیچھے بیٹھی ہوئی اٹھیں کارڈس ڈس کارڈ کرنے میں مدد دے رہی تھی۔

ساحرہ علیم سے کس درجہ گھل مل گئی ہے۔ وہ تو میرے اور علیم کے درمیان ایک ایسا ربط ابھی تھی جو زنجیر کی ایک کڑی کو دوسری سے ملاتی ہے۔ لیکن جب یہ زنجیر ٹوٹ جاتی ہے تو اس کی کڑیاں اٹھیں جو گردوں میں سے جدا ہو جاتی ہیں۔ ہر ان کے ملاپ کا وسیلہ تھکتیں۔

میں صرت اتنی سی بات پر ساحرہ کی مخالفت میں اتنا بہت کچھ کیوں سوچ رہی تھی۔

شاید میرے اندر چھپی ہوئی وہ عورت بیزار ہو رہی ہو جو زندگی کا دا لگا کر بھی اپنی محبت کی ایک ایک کرن کا حساب دنا چاہتی ہو اور علیم تو خاندان بھر میں چٹکی ہوئی دھوپ تھے۔ سب کے جیسے۔ لیکن یہ سورج تو میرا ہی تھا نا۔ بلا شکر ت غیرے میرا۔ میں کچھ ایسا ہی سمجھ بیٹھی تھی۔

پتہ بھینک بھی۔ ساحرہ کی آواز نے مجھے اور علیم کو بیک وقت چونکایا۔

اور علیم نے بھٹ سے پتہ پھینکنا چاہا تو ساحرہ نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔
 ”کیا کر رہے ہو۔ تمہیں ڈھنگ کا پتہ پھینکنا بھی نہیں آتا۔“ علیم کے
 ہاتھ میں ادھر کھلے گول پنکھے کی طرح سجے ہوئے کارڈس میں سے جو پتہ آگے نکل
 آیا تھا۔ اس کو ساحرہ نے پھر سے برابر کر دیا۔ اور بڑے ہی خشکمانہ انداز
 سے کہا۔ یہ پتہ پھینک دو۔

اور علیم نے چپکے سے وہی پتہ پھینک دیا۔
 مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے ساحرہ نے مجھے ڈس کارڈ کر دیا ہے۔
 اور اس کے بعد علیم نے میری طرف کم دیکھا اور میں اپنی یہ توہین گوارا نہ
 کر سکی۔ اور چپکے سے اٹھ کر تاش کی اس محفل سے چلی آئی۔ اس وقت
 شاید میں علیم کے ذہن سے اس طرح محو ہو گئی تھی۔ جیسے ڈس کارڈ کیا ہوا پستہ
 کھلاڑی کے ذہن سے محو ہو جاتا ہے۔

میں جب اٹھ کر جانے لگی تو ساحرہ نے مجھے عجیب نظروں سے دیکھا۔ ایسی نظروں
 سے جو کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ لیکن کہہ جانا ان کے بس میں نہ ہو۔
 میں کسی گوشے میں چھپ چھپ کر پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتی تھی۔ لیکن
 گوشے میں پہنچ کر بھی میرے آنسو نہ نکلے۔

وہ ہارٹ کی بیگم۔ علیم نے ڈس کارڈ کی ہے۔ وہ تو تم۔ وہ تو تم ہو۔
 وہ تم ہو۔

”میں نہیں ہوں۔ میں نہیں ہو۔ میں نہیں ہوں۔“ میری زبان
 سے بہت آہستہ سے یہ الفاظ نکلے۔

اور دوسرا سو میرے گالوں تک ڈھٹاک آئے۔

”یہ کیا ہے۔۔۔ بگلی۔۔۔“ میں نے اپنی آنکھوں پر نرم ہاتھوں کا لمس محسوس کیا۔

یہ ہاتھ ساحرہ کے تھے۔۔۔ میں تڑپ کر رہ گئی۔

”خدا را مجھے تنہا چھوڑ دو ساجی“

”لیکن تم وہاں سے اس طرح اٹھ کر کیوں چلی آئیں“

”تمہیں اس سے کیا مطلب“

”بہت ہو چکی جو اس۔۔۔ چلو میرے ساتھ۔۔۔ میں نے جو کچھ کیا ٹھیک ہی

کیا ہے۔۔۔“

ساحرہ لمحے بھر کے لیے رکی۔ پھر کہنے لگی۔ ”تمہیں پتہ ہے ساری نظریں تم

دو ذوں ہی کو تک رہی ہیں۔۔۔ تم لوگ اس طرح ہوش کیوں کھو دیتے ہو اپنے

— قریب آتے ہو تو سلیقے سے ایک دوسرے سے بات تک نہیں کر پاتے سٹی گم

ہو جاتی تہیں بس۔۔۔ ایسے جیسے تحت نہیں کر رہے ہو۔۔۔ زندگی سے ڈر رہے

ہو۔۔۔ جذبے اور احساس سے ڈر رہے ہو۔“

میں بیسے ہوش میں آنے لگی۔ میرے اور علیم کے دل و دماغ اور نطق و لب

کی دسے داریاں کھلی جب ہماری سوتی جاگتی آنکھوں پر پردے ڈالتی پھرتی ہے

— لیکن اس پردہ داری سے اسے کیا مل جاتا ہے؟ ۱۹۔

اس کے اصرار پر میں پھر سب لوگوں میں آئی۔

تاش کی محفل جو پرخواست کر دینے میں علیم پیش پیش تھے طے یہ ہوا کہ آنکھ جو بولی

کھیلی جائے لیکن ہم لڑکیوں نے اس کے خلاف احتجاج کیا۔

علیم نے مجھ سے آنکھوں سے آنکھوں میں انتہائی کہ میں مدافعتی ہو جاؤں اور میں نے نہ صرف آمادگی ظاہر کر دی بلکہ دوسری سہیلیوں کو بھی ہموار کر لیا۔ کھیل شروع ہوا تو میں اس پھولوں کے جھنڈ کی طرف بھاگی مستقل طور پر میری جائے پناہ تھی۔ میں نے جھنڈ کے پیچھے خود کو چھپایا اور خرم گوش کی طرح دیک گئی۔ ساری لڑکیاں اور لڑکے قد والی کالج کے سنج کج میں پھپھتے پھر رہے تھے مجھے شک گذرا کہ اس لڑکی نے مجھے پھولوں کے جھنڈ میں پھپھتا ہوا دیکھ لیا ہے تو چور بنی تھی۔ میں اس ادھیڑ بن میں تھی کہ یہاں سے کہیں اور جا پھپھوں گی کہ پیچھے سے کسی نے مجھے دبوچ لیا۔ میرے پیچ نکلتی نکلتی رہ گئی۔ میں سمجھ گئی کہ میں چور بن گئی ہوں۔ لیکن مجھے تو ایک ایسے چور نے دبوچ لیا تھا جس نے مجھ سے میرا سب کچھ چرا لیا تھا اور اس اداسے کہ میں لٹ لٹ کر سکر رہی تھی۔ راتوں کی نیند اس نے چرائی تھی۔ دن کا سکھ اس نے چرا لیا تھا۔ اور اب اس پھولوں کے جھنڈ میں آ پہنچا تھا کہ قد والی کالج میں میرا یہ گوشہ عافیت کبھی چرائے جو مجھے ساری دنیا کی نظروں سے چھپا کر اس کی بے چین نظروں کا نظارہ کرنے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ ہش۔ اس نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور مجھ سے ہر گوشوں میں کہنے لگا۔ بس زندگی بھر ہم دونوں یہیں چھپے رہیں گے۔

میں علیم سے اس قدر قریبے احساس ہی سے سلگا اٹھی تھی اور اب جب کہ اٹھوں نے مجھے اپنی باہوں میں لے رکھا تھا تو میرا جسم جیسے جل رہا تھا۔ میری ساری ہستی آتش تھی ہو رہی تھی میری نس نس میں ایک آتش سیال رواں تھی۔ میری کن پیٹیاں

پھر ک رہی تھیں۔ میرے دل کی دھڑکن جیسے خود بخود سنائی دے رہی تھی۔
 پھر علیم کے ہونٹوں کا لمس میں نے اپنی گردن پر محسوس کیا۔ میں تڑپ کر ان
 باہوں سے نکل جانا چاہتی تھی، جن باہوں کے حلقے میں محصور ہو کر ساری زندگی گزار
 دینے کا مجھے ارمان تھا۔ میں نے کوشش کی لیکن باہوں کی زنجیر نے مجھے کس کر
 رکھ لیا۔

اور ہم دونوں اسی عالم سرشاری میں اس چور کو بھول بیٹھے تھے جو قسمت کی طرح ہمارا
 تعاقب کر رہا تھا۔ کہ کسی نے قریب ہی سے کہا۔ ”کوئی آ رہا ہے۔ کوئی آ رہا ہے۔“
 علیم مجھے بھوڑ کر الگ ہو گئے۔ میرے گالوں میں اڑنے والا خون جیسے سرخی رخسار
 بن کر منجمد ہو گیا۔ ایک ایسے خوف نے ہماری محبتوں پر پھوپھوپ کر پیچھے سے دار کیا
 تھا جو خود ہماری محبتوں ہی کا پردہ درہ تھا۔ میں پسینے میں نہا نہا کر رہ گئی۔ یہ
 کیسا لمحہ تھا۔ کیسی گھڑی تھی۔ یہ کیسا پل تھا جو بکلی بن کر ہم پر گر گیا تھا۔
 یہ کون ہے جو ہمیں دوسروں کی آمد کا احساس دلارہا ہے۔ میں تو اس سے
 بھی مخالف تھی جو میرے اس راز سے واقف ہو کر مجھے دنیا کی نظروں سے بچا لینے کے لیے
 اپنے تعاون کی پیش کش کر رہا تھا۔

تم کہیں اور چلی جاؤ راجی۔ اگر کوئی دیکھ لیتا تو؟ اور میں نے آواز
 پہچان لی۔ یہ سا جوہ تھی۔ میری اپنی راجی۔ علیم کے اور میرے درمیان
 جو ایک رابطہ تھا۔ ایک واسطہ۔ ایک وسیلہ۔ زنجیر کی کڑیوں کا وہ جوڑ جو
 ایک کڑی کو دوسری سے ملاتا ہے۔

”تم لوگوں نے کوئی اچھی حرکت نہیں کی۔“ وہ پھر کہنے لگی۔ اور علیم نے

اسے بڑی ناگواری سے دیکھا لیکن ساحی نے عظیم کی ان نظروں کی بالکل پروا نہیں کی۔
 اس کا اس طرح ہمارا تعاقب کرنا مجھے بڑا ناگوار محسوس ہوا۔ وہ آخر کون
 ہوتی ہے ہمارا سایہ بن گئی ہے اس کی اس دوستی کے نتیجے آؤ کون سا جذبہ ہم
 کر رہا ہے۔ مجھے تو اس پر کچھ شک سا ہونے لگا اور یہ شک اس وقت یقین
 سے بدل گیا۔ حیب میں نے دیکھا کہ ہماری طرف کوئی بھی نہیں آ رہا تھا۔ ساحر
 نے ہماری ایک جاتی سے جل کر صرخت ہمیں جدا کر دینے کے لیے ہمیں کسی کی آمد
 سے ڈرایا تھا۔ اور میں اس لیے ڈر گئی تھی کہ ایسے میں حیب کہ دو دل مل بیٹھ
 ہوں، کوئی آدھکتا ہے تو وہ اکیلا نہیں ہوتا ہے۔ تنہا نہیں ہوتا، ایک دنیا
 اس کے ساتھ ہوتی ہے، ایک زمانہ اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ لیکن یہاں
 تو کوئی نہیں تھا۔

عظیم ٹکڑ کر دوسری طرف جانے لگے تو ذکیہ نے جو اس وقت پور تھی عظیم کا
 تعاقب کیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ عظیم کو جا لیتی، کوئی دوسرا ہی اس کے ہاتھ
 لگ گیا۔ وہ راہی تھی جو پاس ہی پیر طے کے پیچھے چھپی ہوئی تھی۔ اور ذکیہ
 راہی سے چھپی ہوئی چلا رہی تھی۔

”راہی چور راہی چور۔۔۔ سا تھیو باہر آ جاؤ۔۔۔ راہی پکڑ لی گئی۔“
 رکے سب چھپے ہوئے گوشوں سے کچھ اس طرح نکل آئے کہ دوسرا یہ بھی نہ
 جان سکا کہ کون کہاں چھپا تھا۔

میں بھی اٹھی تو ساحر نے میری ہانہ پکڑ کر کہا۔۔۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے روتی
 ۔۔۔ غلط رہو۔۔۔ کوئی دیکھ لیتا تو۔۔۔ اور پھر۔۔۔ اور پھر۔۔۔ اتنا

زرب بھی تو اچھا نہیں۔

میں نے تنک کو بانہ چھڑائی۔ اور اپنی دوسری ہتھیلیوں میں بھاگ آئی۔
اس کے بعد میں نے خود کو پیور سے زیادہ علیم سے پھپھائے رکھنے کے
جتن کیے۔

آنکھ مچولی جا رہی۔

میں نے دیکھا ساچی علیم سے کچھ ایسی باتیں کر رہی تھی جس کا علیم برا مان رہا
تھے اور یہ باتیں یقیناً ہم دونوں کی یک جانی کی مخالفت میں ہوں گی۔ میں نے
سوچا علیم سے صاف دھماکتا کہہ دوں کہ اب تمھارے خط کے ایک ایک لفظ
کے لیے مجھے برس برس بھر ترسنا گوارا ہے لیکن یہ گوارا نہیں ہے کہ کوئی تمھارا اور
میرا سایہ بن جائے۔ اور واقعی مجھے ساچی سے دشت سی ہونے لگی تھی۔

لیج کا دقت آیا اور ہمیں اطلاع دی گئی تو ہم سب آنکھ ہونے لگے۔

علیم بھری محفل میں مجھ سے بات کرتے ہوئے یوں بھی اجتناب کرتے۔ لیکن
بعض ڈشز واقعی اتنی اچھی تھیں کہ انھوں نے ٹرمہ کر خود میری تواضع کی اور دو ایک
بار اپنی پلیٹ سے میری پلیٹ چپکے سے کچھ چیزیں منتقل کر دیں۔ بٹھے تھا اور
یہ مواقع ہمیں آسانی سے فراہم ہو سکتے تھے۔ جو ہوئے بھی۔

اس نعمت کے باوجود بھی جو مجھے حاملِ حق ہیں اس طرح چلنے لگی تھی جیسے کوئی
چور سارا اثاثہ بٹور کر واپس جاتے ہوئے صاحبِ خانہ کے قریب سے بچوں کے بل
چلتا ہو۔ اس دروازے کی طرف جس دروازے کو اس نے اپنی دایمائی کے لیے
کھول رکھا ہو۔

لیکن ساحرہ تو علیم کی بھیجی ہوئی دولت کے کر میرے خانہ دل میں آئی تھی۔ اور جب یہ دولت میں نے سوچتے سے چھپا کر رکھ لی تو وہ چوروں کی طرح بٹور کر بیچوں کے بل واپس جا رہی تھی اور وہی دردِ داندہ اس نے واپسی کے لیے کھلا چھوڑ رکھا تھا جس سے وہ داخل ہوئی تھی۔

لیکن پرخ پر وہ موجود نہیں تھی۔ میں نے کتنا اسے تلاش کیا۔ اپنی ہجولیوں و سرہیلیوں سے پوچھا۔ سب حیران تھے۔ وہ یکایک کہاں چلی گئی۔ کیوں چلی گئی اس کے سوا اور کوئی سہیلی موجود نہ ہوتی تو یہ خیال بھی ہو سکتا تھا کہ کہیں گھوم پھو رہی ہوں گی۔

مجھے رانی نے چپکے سے بتایا۔ کہ اس نے ساحی کو ادب پر چڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ یہ بھی دیکھا ہے کہ وہ آبدیدہ تھی۔

میں نے کہا چلی تو ذرا ادب دیکھ آئیں۔ اس کا اسکوڑ ہے یا نہیں۔ بھڑی سیڑھیوں سے گزر کر ہم ادب پر پہنچے تو اس مقام پر جہاں موٹر میں پارک کی گئیں تھیں۔ ساحی کی ”وسپا“ نہیں تھی۔

ہمیں اس کی واپسی کا یقین ہو گیا اور ہم نشین چمن میں لوٹ گئے۔

لیکن یہ بات کہ وہ آبدیدہ تھی۔ نہ ہر کا بوگرہ بوگرہ بن کر میرے ذہن پر گر رہی تھی۔

رانی جیسے مجھ سے درد کھڑی ہوئی کہہ رہی ہو۔

”وہ آبدیدہ تھی۔“

پھر جیسے قریب آکر اس نے کہا۔

”وہ آبدیدہ تھی۔“

میں نے پھر بھی نہیں سنا تو۔۔۔ اس نے پیسے میرے کان میں کر دیا تھا۔

”وہ آبدیدہ تھی۔“

لہجہ ختم ہوتے ہوتے وہ لوٹ آئی۔

رابی نے بڑے چاؤ سے کھانا اس کے لیے میز پر چن دیا جو اس نے بڑے

بی اہتمام اور احتیاط سے ساتھی کے لیے محفوظ کر رکھا تھا۔

رابی کی اس حرکت نے ہماری دوسری سہیلیوں کے ساتھ تجھے بھی کچھ کے

دیے کیسی اچھی حرکت کی رابی نے۔ دوستی کی محبت کی۔ ایسی حرکت جو چپکے سے

دل میں دور دور تک اپنے لیے راستہ بنا لیتی ہے اور پتہ تک نہیں چلتا۔

ساتھی کے لیے یہی سب کچھ تو تجھے کرنا چاہیے تھا۔

میں نے دیکھ لیا تھا آبدیدہ تھی۔۔۔ اور میں یہ جان کر اس لیے خوش

ہو گئی تھی کہ اس کی آنکھوں کی یہ نمی۔ اس کی پلکوں کا یہ بھیکنا پن (اسی دوستی کے

ضمن میں تھا جو تجھ سے اور علیم سے دو بیک وقت نبھا رہی تھی۔ اس دوستی

کے ضمن میں تھا جو کبھی کبھی میرے ذہن میں اپنا روپ بدل کر اچھرنے لگی تھی۔

لیکن میں قطعی طور پر یہ تصفیہ نہ کر پائی تھی کہ ساتھی کی دوستی اور دشمنی میں کتنا

فصل ہے۔ اب جو وہ چپ چاپ اپنے کھانے پھکی ہوئی تھی۔ تو اس کی

اس بے بسی پر نہ جانے کیوں مجھے سکون سا مل رہا تھا۔

میں ایسے جذبے اپنے دل و دماغ میں ساتھی کے لیے پروش رہا تھا۔ لگی

تھی جو بیک وقت ہمدردی اور نفرت کے پروردہ تو ہوتے ہیں لیکن محبت کے

پیدا کر دکھی نہیں ہوتے۔

اور یہ سارا انقلاب مجھ میں کج ہی پیدا ہوا تھا۔

اسی قدوائی کالج میں جس کے گیٹ میں داخل ہونے کے بعد موٹروں کی پائونگ کے حصے سے نشیب چمن میں جانا چاہیے تو ہمیں ان سیر پھیلوں سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے۔ جو بلند ری سے ان شاخوں میں بیضوی شکل میں بٹ گئی ہیں۔ اور نشیب چمن میں پھر مل گئی ہیں۔ اس قدوائی کالج میں جہاں سیر پھیلوں سے اترتے ہوئے میں اپنی مرضی سے سب سے پیچھے رہ گئی تھی اور بلند ریوں پر کھڑے کھڑے اس خوبصورت سے اجلے، سفید، سفید قافلے کا نظارہ کیا تھا۔ جو ان بیضوی سیر پھیلوں پر موتیوں کی مالابین کیا تھا۔ اور یہ مالابین میں پورے کچھ کرکٹ رہی تھی اور اس کے موتی دانہ دانہ ہو کر کچھ رہے تھے۔

اور اب مجھے یقین ہو چلا تھا کہ یہ کچھ سے ہوئے موتی اگر مالاکاروپ دھار لیں بھی تو وہ موتی اس میں نہ پر دئے جاسکیں گے جو میری اپنی نظر میں سب سے زیادہ تاب دار تھے۔

اور وہ موتی تھے عظیم میں اور ساجی۔

ساجی کھانا کھا چکی تھی اور سبز سے اٹھی تو میں بھی اس کی اداسی سے سکون پا کر خیالات کی دنیا میں ادھر ادھر بھٹک رہی تھی۔ قدوائی کالج میں اس طرح لوٹ آئی جیسے مجھے ادین لٹے میں اپنے تجرب کی اماں پانا نہیں ہے بلکہ کسی چھپے ہوئے دشمن کے مضبوط بازوؤں کے بھر پور وار سے بچ نکلتا ہے۔

اور میں اپنے انہی تصورات کے ساتھ جیسے ساجی کے مقابل ہو گئی۔

لیج کے بعد نوڑھوں نے سستانے کا پردہ گرام بنا لیا۔ اس سستانے میں نیم دراز ہو کر قیلوہ کرنے سے لے کر پان دان کھول کر گلوہریاں بنانے، پھر گلوہریاں منھ میں رکھے جگالی کرنے تک کے سارے مشاغل شامل تھے۔ میلوں ٹھیلوں میں، تفریحوں میں جب کہ زندگی ذرا تیز کام ہو جاتی ہے بڑے بوڑھوں کا گھنے پیڑوں کے ٹھنڈے سایوں میں ذرا کی ذرا پل بھر کو سستا لینا، میچلے نو جوانوں کے لیے لمحہ فکریہ بھی ہوتا ہے اور لمحہ نشاطِ حیا بھی۔

ایک تو ایسا لگتا ہے جیسے بزرگوں نے جن کی عقابی آنکھیں تین میں جھومتے ہوئے پھولوں پر نظر رکھتی ہیں۔ ان کی اڑتی ہوئی خوشبو پر نظر رکھتی ہیں۔ ٹھک ہار کر کہیں بیٹھ رہی ہیں تاکہ ”آگے چلیں گے دم لے کر“ اور ان لمحاتِ نزہت میں پھول زیادہ جھوم لیتے ہیں۔ خوشبو ہر نفس کے لیے شمیمِ جان بن جاتی ہے۔

لیج کے بعد ہی سب کچھ ہو رہا تھا۔ لیج کے بعد قدوائی کا جٹھیں ایک دنیا اونٹھ رہی تھی، ایک دنیا نئی ترنگوں کے ساتھ کسما کر بیدار ہو رہی تھی۔ بیدار ہوتی ہوئی دنیا نے اپنے پر توے۔۔۔ چلو چلتے ہیں۔۔۔ ذرا ادھر ادھر گھوم آئیں۔ شام ہوتے ہوتے تو واپسی ہوگی۔ گھومنے پھرنے کا اب یہی تو ایک موقع ہے۔

بات دہی زبان سے نکلی تھی جو لغزہ بن کر زبان زد ہو گئی۔ اور جیسے اس لغزہ بازی سے نوڑھ چونک اٹھے۔

نہیں کبھی لیج کے بعد یہ گھومنا پھرنے کا اس کی دانش مندی ہے لیج کے بعد تو سستانا چاہیے۔۔۔ کچھ تاش چلنے دو بیٹھے بیٹھے یہیں پر۔“

ہم نے ایسا کون سا ٹکڑا بیچ کیا ہے۔۔۔ یہی جتنا آپ لوگ ناشتہ کرتے ہیں؟
 سب ہنس پڑے۔ بزرگ بھی فوجوان بھی۔۔۔ سبوں نے ہلٹ کر دیکھا۔ ساجی
 یہ جملہ کہہ کر اسی چپ چاپ کھڑی تھی جیسے ضرورتاً بھی مسکرا نا بھول گئی ہو۔

ہم گھومنے پھرنے کے لیے نکل پڑے۔۔۔ ذرا فی کمانچ کے احاطے سے باہر
 نکلنے وقت گیٹ کی اوٹ سے کسی نے میری بائیںہ بکڑی میں ذرا رنگ گئی تو علیم
 نے مجھے ترپ کر اس طرح دیکھا جیسے نہ رنگی بھر ایک لمحے کی مجھ سے بھاری بھی وہ
 سہم نہ سکیں گے۔ میں نے آنکھوں آنکھوں میں انھیں قسائی دی کہ بس اعلان تک
 پہنچتی ہوں۔۔۔ لیکن گیٹ کی اوٹ میں پھٹی ہوئی ساجی پر نظر پڑتے ہی علیم
 بکھٹ ہوا ہے پاس بھاگ آئے۔ ایسے جیسے ہم دونوں کی پاک جانی سے ڈرتے ہوئے
 ۔۔۔ ہم دونوں کا سر ایک دوسرے سے جڑ کر آہستہ سے اٹھرایا۔۔۔ پھر بڑے
 چارے ساجی کے دونوں ہاتھ علیم نے اپنے دونوں ہاتھوں میں ختم لیے۔۔۔
 انھیں بڑی نرمی سے دبایا۔۔۔ پھر گال سملائے۔۔۔ بگنی انیس کی۔۔۔ اس قدر
 برا مان جاتی ہے۔

ساجی میرا ہاتھ چھوڑ کر آگے بڑھ گئی تو علیم پیچھے رہ گئے۔ لیکن اس منٹ
 بھر میں میرا یہ حال ہو گیا تھا۔ جیسے سر باز اس آدمی نے میرے منہ پر پھونک دیا
 ہو۔ جس کو میں چاہت کی نظروں سے تک رہی تھی۔ میں بھلا ساجی پر ترس کھانے
 چلی تھی۔۔۔ اس ساجی پر جس نے مجھے اپنے برابر کھڑے نہ رہنے کے قابل بھی
 نہ رکھا۔

علیم کی اس حرکت نے مجھے جیسے بلندی سے گرا دیا تھا۔ ایسی بلندی سے جس پر

علیم خود میرا ہاتھ تھام کر لے گئے تھے۔

ساحی مجھ سے کہنا چاہتی تھی۔۔۔ بڑی لجاجت سے اتنی لجاجت سے کہ شاید وہ میرے پیر بھی تھام لیتی۔۔۔ شاید شاید وہ علیم کو مجھ سے مانگ لینا چاہتی تھی۔۔۔ لیکن جب خود دوڑ کر اس کے آگے جھک گئے تھے تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ساحی نے میری غلط فہمیوں کے منہ پر ایک طمانچہ مارا ہے منٹ بھر میں، پھر ایک بار ساری بساط الٹ چکی تھی۔۔۔ میں سوچ رہی تھی کہ علیم میرے ہیں یا ساحی کے۔۔۔ دست سوال مجھے دراز کرنا پڑے گا یا ساحی کو۔۔۔ میں تو، جب ساحی آبدیدہ ہو کر اس انجن سے فرار ہوئی تھی یہ سمجھ بیٹھی تھی کہ میں ساحی پر جب چاہے مکر اسکتی ہوں۔ جب چاہے مکر اسکتی ہوں۔

لیکن اب خود میرا یہ حال ہو گیا تھا کہ ساحی تو کیا ہر شخص مجھ پر ترس کھا سکتا تھا۔

ساحی نے اپنے قدم تیز کر دیے تھے۔

میں پیچھے رہ گئی تھی۔

وہ شاید سمجھوں میں سما جاتی تو میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

علیم اس طرح گم سم تھے۔ جیسے ہمارے جیت کا نقشہ جوار سبہ ہوں۔۔۔ میں نے بھی ان کو نظر انداز کر دیا۔۔۔ میرے اندر کی عورت پھر بیدار ہو گئی تھی۔ وہ عورت جو مرد کے قدموں تک جھلکنا گوارا کرے۔ یہ بھی تو عورت کے آگے سر خم کرنا کبھی بھی گوارا نہیں کر سکتی۔ اور پھر ایسی صورت میں جب کہ اس کی محبت چھپنی بھا رہی ہو۔

میرا پتہ راز اب اس عورت کا پتہ راز تھا جس کی دوسری عورت نے محبت

چھین کر ہی زخمی نہیں کیا تھا بلکہ جس کا تجویب خود بڑی امانت سے اس کا ہاتھ
چھانک کر اس عورت کی طرف بڑھ گیا تھا۔ جس نے محبت چھپینی نہ تھی۔
رومی ٹھٹھہر بناؤ۔

پیچھے سے علیم نے مجھے اس طرح پکارا جیسے ان کی آواز میں دنیا بھر کا
دکھ درد سمیٹ آیا ہو۔

ساتھی مجھے اور علیم کو پیچھے چھوڑ کر شاید بھوں میں جا ملی تھی۔
میں بھی چاہتی تھی کہ علیم کو پیچھے چھوڑ دوں۔
لیکن ساتھی سے آگے نکل جاؤں مگر کوئی بات میرے بس میں نہ تھی۔
پھر بھی میں نے اپنے قدم اور تیز کر لیے۔

علیم نے بالکل اس طرح پکارا جیسے پیہا پانی کہاں، پکارتا ہے۔
میں نے بار بار پیسے کی آواز کو اس طرح بھی محسوس کیا ہے۔ جیسے یہ آواز
اپنے دل سے پیدا ہو رہی ہے، میری اپنی زبان سے نکل رہی ہو اور میرے اپنے
ہی کانوں میں وودھی وودھیکا رہی ہو۔

لیکن آج میں نے علیم کی اس آواز کو سنی ان سنی کر دیا تھا۔ بالکل ایسے جیسے
اس آواز کی لذتوں سے میں آشنا ہی نہیں ہوں۔

ساتھیوں کی ٹوٹی مسلسل نشیب و فراز سے ہو کر گزرتی رہی تھی۔ میری سکر
گھنے درختوں کا ایک سلسلہ سا دور تک شروع ہو رہا تھا اور یہ ٹوٹی اس سلسلے
کے پتوں بیج پتوں چکی تھی۔ جب کہ میری کے یہ سائے میرے قدموں کے نیچے
ابھی ابھی جھکے تھے۔ علیم ابھی دھوپ ہی میں تھے اور سایوں تک پونچ نہ پائے تھے۔

ایک ایک دو پرندے پاس ہی کے ایک پودے سے اڑے اور بیری کی ٹہنی پر بیٹھ کر محو اختلاط ہو گئے۔ سیری نظر میں ان پر جم گئیں تو کسی نے ہاتھ بڑھا کر سیری آنکھیں ڈھانپ لیں۔ میں نے تڑپ کر گرفت سے نکلنا چاہا تو باہوں کے حلقہ زنجیر میں جکڑ کر رہ گئی۔ عظیم پیر دبا کر پتہ نہیں کب مجھ تک آ پہونچے تھے۔ ان کے قدموں کی چاپ یا تو میں نے سنی نہیں یا پھر مجھے اپنے دل کی دھڑکن کا گمان گزرا ہو گا جو میں نے اس کو نہیں پہچانا۔

بیری کے ان درختوں سے پرے ذرا سے نشیب میں ایک بھاڑی کے نیچے ایک ہلکی سی چھنسنائی دی۔ میں اور عظیم جدا ہوئے تو یہ چھنکراہ میں بدل گئی۔ لیکن میں ابھی تک اپنی ہی آگ میں جل رہی تھی۔ میرا سارا وجود خود ہی ایک چھن بن کر رہ گیا تھا۔ سیری اتنی خود ہی مجھے ایک کراہ معلوم ہو رہی تھی۔ اور مجھ میں بیدار ہوتا ہوا عورت کا پسند اور اس منٹھاس میں تلخیاں کھول رہا تھا۔ اور پاس ہی کوئی کراہ رہا تھا۔

بالکل اس طرح جیسے میرا وجود کراہ رہا تھا۔ سیری زنجی روح کراہ رہی تھی۔ عظیم سے جب اہو نکر میں بڑی بے دلی اور سردہری سے آگے بڑھنے لگی تو اس کراہ نے دامن دل کو پھرتے تھا۔

دافنی کوئی قریب ہی تھا۔

میں نے پلیٹ کر عظیم کو صرف اس لیے دیکھا کہ ان سے کہہ سکوں کہ وہ اس کراہ کی تہہ تک پہونچیں۔

وہ بھانپ گئے۔ کہنے لگے تم بھی چلو۔ دیکھتے ہیں۔

میں زندگی بھر کے لیے علیم کا قرب چاہتے ہوئے بھی کم از کم اس وقت ان سے دور رہنا ہی چاہتی تھی تاکہ وہ میری سے پوری طرح متاثر نہ ہوں کیونکہ ان کا قرب میرے علم و غصہ کے اظہار کے لیے مشکل تھا۔

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

کچھ دیر تو وقت کر کے انھوں نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے التجا کر رہے ہوں لیکن جب میں نے نظر میں پھیر لیں تو وہ آگے بڑھ گئے۔

بھاری کے قریب پہنچے تو نشیب میں انھوں نے جھانک کر دیکھا اور ٹھٹک سے گئے۔

میں نے دور ہی سے پوچھا کیا بات ہے۔ انھوں نے اشارے سے مجھے قریب

بلایا۔

پہلے تو میں نے ہنس و پیش کیا۔ پھر کراہنے کی آواز سنی تو فیم خود بخود اٹھ گئے۔

قریب پہنچی تو علیم نے مجھے سہارا دے کر نشیب میں جھکایا۔

وہاں تو باجی کانٹوں میں لکھی ہوئی پڑی تھی۔

میرے تن بدن میں اگ سی لگ گئی۔ میں نے علیم سے کہا۔ کو دیر بیٹھا آپ بھی۔ اٹھا لائیے بے چاری کو اب تو وہ چلنے کے لائق بھی نہ ہوگی۔ آپ ذرا سا اٹھالیں تب ہی بیڑا پار ہو۔

طنز کے یہ نثر علیم نے سہہ لیے اور چپکے سے نشیب میں سنبھل سنبھل کر اترنے لگے۔ مجھے ان کی یہ حرکت اور بھی بری لگی کہ انھوں نے میرے دل کی لگی کو سمجھ کر

بھی اس کو کوئی اہمیت نہ دی۔ چھوٹے منہ تو کہہ دیتے کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔
 علیم نے جھک کر ساجی کو سہارا دیا تو اپنی دو دونوں باغیوں ان کی گردن میں جامل کر
 وہ جھول نکلتی۔ اور اتنی سفاکی سے کہ میں جل گئی۔

یہ معاندانہ رویہ اس طرح کھلے بندوں ساجی نے کبھی اختیار نہ کیا تھا۔ میرا
 اپنا عالم یہ تھا جیسے میری اپنی لاش کا آخری دیدار کرنے کے لیے میں نے ہی اپنا کفن
 سر کا ہیڈور میں اپنے مردہ چہرہ پر حسرتوں کی ریکھائیں پڑھ رہی تھی کہ جیسے ساجی
 نے نفرت سے چہرہ ڈھٹنگ دیا۔

علیم سہارا دیکر اسے اوپلے آئے تو وہ بدقت تمام علیم کے سہارے لنگراتی
 بیوٹی مجھ تک پہنچی۔ اور میرے قریب آ کر یکایک اچھلی پڑی۔
 پھر اچھی بھلی تائیاں بجا بجا کر بیٹنے لگی۔

میری حالت دیدنی تھی۔ اس سے اچھا تو یہ تھا کہ ساجی مجھے طمانچہ لگا دیتی
 بلکہ بچھی سے میرا سرا سینہ بھلنی کر دیتی۔ میرے دل میں ایک نہیں کسی پٹل کی گویاں
 اتار دیتی۔ مجھے تو یہ احساس ہوتا کہ میں اس کے برابر کی کوئی ہستی ہوں۔
 لیکن ساجی نے ایسا کچھ بھی تو نہ کیا۔ میرے پن اور کو، میری زندگی کو، میری
 محبت کو اس نے اپنے قدموں پر جھکایا ان کی تذلیل کی تو پھر کھڑک لگا کر جیسے جھ
 سے کھینٹنے کے سے انداز میں تائیاں بجا کر بیٹنے لگی۔

مجھ سے رہا نہ گیا۔ کسی اندرونی جذبے نے میرا ہاتھ اٹھوا دیا قریب تھا
 کہ اس کے گالوں پر میں طمانچہ جڑ دیتی کہ علیم نے میرا ہاتھ تھام لیا۔
 علیم کی اس طرنداری نے جلتے پرتیل کا کام کیا اور میں کانپ کانپ

کئی پھر ضبط کے سارے بند ڈوٹ کر آفسو اس طرح میری آنکھوں میں اٹا آئے کہ
میں نے بھی ان طغیانوں میں بہہ جانے کو اپنی عافیت جانا — میں اتنا روتی کہ
میری ہچکیاں بندھ گئیں۔

سامی نے مجھے اس طرح بے حالی دیکھا تو سہم کر رہ گئی۔

پھر بیکایک اس نے سر میرے سینے پر ٹیک دیا۔

رند سے ہوئے گلے سے وہ کہنے لگی — روحی میں اس وقت بہت خوش
ہوں لگی۔ اس لیے کہ آج میں اس قابل ہو گئی ہوں کہ تجھے تیری وہ خوشیاں بھی لوٹا
دوں جو میں نے اپنے لیے اٹھا رکھی تھیں لیکن تو نے مجھے بالکل غلط سمجھ لیا ہے کچھ
پتہ ہے تجھے — میں نے آج تک دوسروں میں صرف خوشیاں ہی تقسیم کی ہیں اور
سارے غم اپنے ہی پلو میں باندھ رکھے ہیں۔

خالد نے ایک دن چنبیلی کی کچی کلیاں میرے دامن میں ڈال کر کہا تھا یہ
ذکیہ کو چپکے سے دے آنا۔ میں اس سے یہ بھی نہ پوچھ سکی کہ یہ کلیاں میں کیوں نہیں
رکھ سکتی۔

عید کے بھرے گھر میں عرفان نے میرا ہاتھ پکڑ کر بڑے چاؤ سے مجھے گھیسٹا
میں ہاتھ چھڑا کر لمبی لمبی سانسیں لیتی اس کی نظروں سے ادھل ہو گئی۔ دل نے
اس مختصر سے حادثہ کو کیسے کیسے رنگ دیے ہیں۔ میں نے کسی کسی خیالوں کی دنیا
آباد کی۔ اسے پائیں بارغ کے کنج میں کسی کا منتظر پایا تو اس طرح چلی گئی
جیسے جانتی ہی نہیں کہ وہ وہاں کسی کا منتظر ہے وہ لپک کر تجھ تک پہنچا بڑے چاؤ
سے اس نے مجھ سے کہا — ”یہ عید کا رڈ رالی کو دے آؤ نا سامی —“

میں تیرے لیے۔“

اور میں عید کا مڑے کر چلی گئی۔ رانی کے ہاتھ میں چپکے سے تھما دیا تو اس نے کہا یہ پانی کے قطرے کہاں سے ٹپکا لائی۔ میں رانی کو کیسے بتا دیتی کہ وہ پانی کے قطرے نہیں تھے۔ میرے آنسو تھے جو عرفان کی لکھی ہوئی تحریر کو دھندلا رہے تھے۔

پھر۔۔۔ پھر علیم نے میرے سہارے تم تک پہنچنے میں بہت ہی دیر لگائی اتنی دیر کہ میں خود ان کے سہارے کچھ دور چل پڑی تھی۔ اپنے پلو کی گرہ سے گلاب کی پنکھڑیاں نکال کر اس نے میری بند مٹھی کو کھولا۔ اور نہایت ہی احتیاط سے رکھ کر پھر مٹھی بند کر دی۔

میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا ایک سمندر ٹھہرا ہوا تھا۔ بہت عمیق، بہت گہرا جس کی کوئی تھا نہ تھی۔

وہ جانے کے لیے لمبی تو میں نے دیکھا اس کی ناگوں جیسی بل کھاتی لمبی لمبی زلفوں میں دو بڑے بڑے گلاب مسکرا رہے تھے۔

سیری نظروں میں علیم کی وہ تحریر پھر گئی جو ساجی کے ہاتھوں مجھ تک پہنچی کہ ”میں نے تمہارے لیے پھول کسی کول سی ایک شاخ سے جدا کیا تھا کہ اسے تمہاری زلفوں کی لمبی سیاہ رات کا چمک دار ننھاسا تارہ بنا دوں۔“

لیکن ان پھولوں کا اس سے جھلا کیا تعلق ہو سکتا ہے۔

پھر میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی ان دونوں سیاہ ناگوں کو پکڑ لیا تو اس نے بہت تیزی سے ان پھولوں کو اپنے بالوں میں ٹھیک کر لیا جو اس کی دانست میں اس کی گھنی

زلفوں کے ایک بال پھونے سے بھی گر سکتے تھے۔ اور اس نے خود ناگن کی طرح بل کھا کر، تڑپ کر مجھے دیکھا۔

”استنہ پیارے ہیں تجھے یہ پھول؟“
 ”ہاں۔۔۔ انہی پھولوں نے تو مجھے اتنا پاگل بنا دیا تھا۔ سہجی کہ میں تجھے ہنسنے کی بجائے رلا بیٹھی۔“

میں نے اس کی گردن میں باہیں ڈال دیں۔ ”مجھے نہیں بتائے گی۔“
 اس نے قریب قریب اپنے ہونٹ میرے کان پر رکھ دیے۔ اور بہت آہستہ سے کہا۔
 ”وہ ابھی ابھی کچھ دیر پہلے اس جھاڑی کے پاس میرے منتظر تھے۔ میں قریب پہنچی تو انھوں نے بڑھ کر جب یہ پھول پیش کیے اور نظر میں جھکا لیں۔ تو میں نے پوچھا۔
 ”یہ پھول میں کسے دے آؤں۔“ جلدی سے بتا دیجئے۔“

وہ خاموش رہے۔ میں نے پھر کہا۔ ”بتا دیجئے۔ کہ آخر یہ پھول میں کسے دے آؤں؟“

انھوں نے کتنی بے بسی سے کہا۔ کیا میں اس قابل نہیں ہوں کہ یہ پھول تمھاری نذر کر سکوں۔ اور ان کی آنکھوں سے گرے ہوئے آنسو انہی پھولوں کے سینے میں کہیں چھپ گئے ہیں۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر پھول ان کے ہاتھ سے لے لیے اور خود ہی انھیں اپنے بالوں میں سجا لیا۔

سہجی اتنا کہہ کر میری آنکھوں میں جھانکنے لگی۔

میں نے بھی اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ آنسو کا سمندر سہجی کی آنکھوں ہی میں کہیں گم ہو گیا تھا اور اب وہاں سکون اور شانہتی کے لمبے سائے تھے۔

کون تھا وہ —“ میں نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

”ادب سے نام لے چکی —“ اس نے پھر اپنے ہونٹ میرے کان پر رکھ دیے۔

”تیرا بھائی بھان —“ میں ترطپ کر رہ گئی — نہ خوش ہو سکی، نہ ساجی کو

گدگدا سکی

تو، تو، میری بھابی —

ہاں — ساجی نے بات کاٹ دی اور اپنے بالوں میں بستے ہوئے پھولوں کے
سو جتن سے بھرتی ہوئی آؤدھ ہونوں کی طرح پھلانگیں لگاتی ہوئی ہماری نظروں سے
ادھل بیو گئی۔ —

میری پہلی بھابی کو مرے کوئی چار برس ہوئے تھے اس وقت بھائی بھان کے
تین لڑکیاں تھیں ان کی سب سے بڑی لڑکی، ساجی سے دو ایک برس بچھوٹی بیو گی۔
میں بھولی گئی کہ میری ایک بند مٹھی میں گلاب کی پنکھڑیاں لپی ہیں۔ — کچھ
پنکھڑیاں گر کر کچھ گئیں تو علیم نے تیکھی نظروں سے مجھے دیکھا پھر کہنے لگے یہ کچھ بتاؤ بھی
روحی آخر کیا بات ہے؟“

میں نے کہا — چلیے آگے چلیں — ہم ساجی سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔

تین مسافر

بیچ تو کا بنا ہے بیخبرہ اس میں بیٹھی مینا
مینا کی گت مینا جانے جھیکن لاگی دنیا

اپنی لاکھٹی سے آنکھوں کا کام لیتا ہوا وہ کپار ٹنٹ میں مسافروں کے بیچ راستہ
ٹوٹتا ہوا کارہا تھا آواز اچھی خاصی تھی یا پھر ماحول کی اداسی نے شاید اس کی
آواز میں سُننے والوں کے لئے زیادہ درد بھر دیا تھا۔ اللہ کے نام پر پیسہ مانگنا
ہو تو دنیا کی بے ثباتی اور زندگی کی غیر یقینی کا ذکر کر کے اللہ سے خوف دلانے کا
گمراہانا سہی لیکن ہے کارہ گمراہ اور پھر اسی صورت میں جب کہ لوگ اپنی ہی آنکھوں
زندگی کی بے مائیگی کا حشر دیکھ رہے ہوں۔

ایکپرس اپنی پوری رفتار سے جا رہا تھا۔ ساری کائنات اندھیرے میں لپٹی
ہوئی تھی۔ کھرکیوں اور شیشوں سے جو روشنی زمین پر پڑ رہی تھی وہ بھی ایکپرس ہی کی

رفتار سے اس کے ساتھ بھاگ رہی تھی۔ اندھیرے میں کھوٹے پودے، درخت، تار
 کے کھجے، سکند، دیسکنڈ کے لیے اجالوں سے چمٹ کر انھیں اپنی یاہوں میں جکڑ لینا چاہتے
 تھے لیکن اجائے بڑی بے رحمی سے انھیں تاریکیوں میں پھینک کر آگے بڑھ رہے تھے۔
 البتہ کپار ٹمنٹ اجالوں سے بھرا ہوا تھا۔ کتنی ہی زندگیاں سر جوڑے موت
 کے خلاف سازش کر رہی تھیں اجائے صرف کپار ٹمنٹ میں تھے۔ سفر کرنے والوں کے
 سینوں میں بھی جیسے باہر کی تاریکیاں در آئی تھیں۔ اور وہ گارہ لگھا۔

بیچ تلو کا بنا ہے بیجرہ

ایک بوڑھی بیوہ برہن گنچے سر پر سفید ساری کا پلو اور بھے آنسو خشک کر رہا
 تھی ایک لمبے بالوں والا دبلا پتلا سا جوان سگریٹ ہونٹوں میں دبائے کھڑکی سے
 لگا ہوا شیشے میں سے پھنتی ہوئی روشنیوں کو تک ہاتھ جو اندھیروں سے گھبرا کر اس
 کی نظروں کے ساتھ بھاگ رہی تھیں۔ ایک اینگلو انڈین ادھیڑ عمر کی فرہ عورت
 اپنی عینک کے شیشے اسکرٹ کے دامن سے صاف کر کے عینک کو اپنی آنکھوں کے
 سامنے لگا رہی تھی اور یہ عمل اس نے دو تین بار کیا تھا۔ ایک سن بھی عورت
 اپنی اور بھتی میں اپنے بچے کو چھپائے دودھ پلا رہی تھی لیکن وہ اس قدر سہمی ہوئی تھی
 کہ اس وقت بھی اس کے چہرے پر درد و رنج کا پتہ نہ تھا۔ ایک پہلوان
 قسم کا گھٹے ہوئے سر اور نوکدار مونچھوں والا آدمی اب اپنی مونچھوں پر تاد دینا
 اس طرح بھولا ہوا تھا۔ جیسے یہ اس کی عادت ہی نہ ہو۔

بھک سفید داڑھی والے ایک مولوی صاحب صفحہ ہی صفحہ میں کچھ درد کرتے
 ہوئے بہت جلد جلد تسبیح کے دانے پھیر رہے تھے ان کی آنکھیں کبھی بند ہو جاتیں

بھی کھل جاتیں۔ دد چار آدمی ایک پنڈت کو گھیرے ہوئے اس کی معلومات افزا
 نیں سن رہے تھے بیچ بیچ میں کوئی کچھ پوچھ لیتا۔ لیکن مکرر پوچھنے کی یا تو ہمت نہ کرتا
 پھر دانستہ گریز کرتا۔ پنڈت جی ذہنی طور پر اندھے بھکاری کے گائے ہوئے
 دہے سے زیادہ قریبی ربط ضبط رکھتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

بیچ تو کاہنہ بنا ہو، اس میں بیٹھی مینا
 مینا کی گت مینا جانے، جھکیں لاگی دنیا

ادھر ابھی تاک گار رہا تھا۔

”کس طرح پھینک دے گا اٹھا کر کوئی، کوئی کہہ رہا تھا آواز میں رت تھی۔
 ”ہاں بھاڑیہ غم تو زندگی بھر کا ہے لیکن مذہبیانہ عمل قابل تر ہے تو گریز سے
 فائدہ۔“ آواز میں دور دور تک کسی جذبے کا پتہ نہ تھا۔

اب آپ ہی سمجھائیے مولوی صاحب۔ پنڈت جی نے اس آواز کی طرف
 مخاطب ہو کر کہا۔

دد دھ پلاتی ہوئی سندھی عورت نے راست چیتن بابو سے سوال کیا بیٹھاری
 عورت کہاں ہے جی۔“ لیکن چیتن بابو بس بہوت بنے سامنے پڑی ہوئی اپنے
 محنت جگر کی لاش کو تک رہے تھے جس نے ابھی کچھ ہی دیر پہلے دم توڑا تھا
 سندھی عورت کا سوال ان کے کانوں تک پہنچا ہو گا لیکن جس سماعت تک پہنچ
 سکا یا نہیں۔ اس کا کچھ علم نہ ہوا۔ اس لیے کہ چیتن بابو نے اس کی طرف نظر اٹھا
 کر بھی نہیں دیکھا۔

پاس ہی بیٹھے ہوئے ایک صاحب نے کہا۔ ”کچھ ہی ماہ ہوئے ہیں وہ

بیکٹھ سدھا رکھی ہیں۔ مجھے اکھوں نے بتایا تھا۔“

”چلو جی اس کی مافی تو اس کے سوا گت کے لیے وہاں ہے۔“ سندھی عورت نے بڑے ہی اطمینان سے یہ بات کہی جیسے اس نے سوال ہی اس جواب کی امید میں کیا تھا۔

پنڈت جی گنگا کی پوترتا، فضیلت اور تقدس کی باتیں کر رہے تھے، اندھا بھکاری اب خاموش ہو چکا تھا۔ اور اپنی لاکھٹی تھامے کپا رٹسٹ کے دردناک سے پیٹھ لکائے اکڑوں بیٹھا بیڑی کے لمبے لمبے کش لگا رہا تھا۔

چیتن بابو اپنی کچھلی زندگی کے شاداب شاداب دپرافوں میں بھٹک رہے تھے۔ اپنی بیتی کی سیندر بھری مانگ کو پہلی بار چوم لینا ہی ایک نئے رومان کی آمد کا پیام بن گیا تھا اور جب یہ بات ان کے کانوں تک پہنچی تھی تو وہ خوشی سے بادے ہو رہے تھے انھیں اندازہ تھا کہ..... الہ آباد سے اپنا میکہ چھوڑ آنے کے بعد ان کی گڑیا سی دھرم بیتی کتنی اداس اداس سی رہتی تھیں۔ کبھی کبھی تو چیتن بابو سے آنکھیں چار ہوئی ہیں تو جھٹ بنا رہی ساری کے پلوٹنے ٹیڑھی ٹیڑھی گھنی گھنی پلکوں میں جھل مل کرتے آنسوؤں کو جذب کر لیا ہے۔ پھر پھسکی پھسکی سی مسکراہٹیں نازک سے ہونٹوں پر اس طرح پھیلی ہیں کہ ٹیڑھی ٹیڑھی گھنی پلکوں کے آنسو ماند پڑ گئے ہیں لیکن چیتن بابو کو یہ تھا کہ ان مسکراہٹوں کے پیچھے بابل کا گھر چھوٹنے کے دے دے غم کی ہلکی ہلکی پرچھائیاں بھی تھپی ہوئی ہیں۔ جو بہر حال ان آنکھوں سے تو نہیں چھپ سکتی تھیں جو دل کی بات سمجھتی تھیں۔

اب جو ننھے کی آمد آمد کی خبر چل نکلی تو اڈ دس پڑ دس میں دیکھتے کے دیکھتے

سب ہی نے سنا۔ لیکن اس میں نہ کوئی اچنبہ کی بات تھی نہ چونک پڑنے کی۔ وہ لوگ جیتن بابو سے تعلق خاطر تھا۔ انھوں نے انہیں چھیڑا بھی، مبارک باد بھی دی۔

رنگ برنگ کی ساریاں گھر کے برآمدے میں لہرائیں، سرسرائیں، پھر ان رنگوں کے بچوں بیچ جیتن بابو کی بیٹی نے ایک اور رنگ کا اضافہ کیا۔ پھر سیلیوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ دپائے، ٹھوکے دیے، چٹکیاں بھریں اور جیتن بابو کی دھرم بتی بجاتی رہیں، سٹپٹی اور سکراتی رہیں۔

اٹا آیا بھی تو بڑی دھوم دھام سے آیا۔۔۔ الہ آباد سے جیتن بابو کا ساک کا سا سسرال حیدر آباد اٹھ آیا تھا۔

جہم پتیاں دکھی گئیں نام رکھا گیا تو لہو تقسیم ہوئے مندر سے لمبی جٹاؤں والے فقیر پکڑوائے گئے۔ انہیں پیٹ بھر کھلایا گیا۔ پنڈتوں کے جہنی کے لیے خاص اہتمام کیے گئے۔

جیتن بابو کی سسرال نے بنگوڑے کی رسم میں دل کی ہر خواہش پوری کی۔ ایک نہیں کہی جوڑے قریص، بش شرٹ، بابا سوٹ، سید سوٹ، بنیائی سوزے، سوٹر، کنٹوپ، پھر کھلونوں کا اچھا خاصا چھوٹا سا خزانہ۔

اس کردار سے آئے ہوئے نئے ہمان نے ان سے استفادہ کرنے کی جیسے قسم کھا رکھی تھی۔ شفا بیچارہ سدا کا مرل تھا، ذرا مسخ پر پانی آیا کہ پھر کچھ نئی نکال بیٹھا۔ نہ غوں نہ غاں۔ ”ٹیک ٹیک دیدم دم نہ کشیدم“ کے مصداق پڑا بڑا ٹکڑا کر مال کا نسخہ تکے جاتے۔ سال بھر کے ہوتے ہوتے دنیا بھر کے بچے تو دنیا بھر ہی کا اثاثہ ہوتے پھرتے ہیں۔ رکھنے کی چیزوں کو توڑتے ہیں توڑنے کی چیزوں کو جوڑنے کی

کوشش میں اور بھی توڑتے پھوڑتے ہیں۔ لیکن ننھے کی عمر سال بھر سے اونچی ہوگئی
 پھر دیکھتے دیکھتے دو سال کی زندگی کا تجربہ ان کے پیچھے تھا لیکن اس کو کچھ بھی نہ آیا
 بس رونے سے مطلب تھا۔ ہنسا بھی تو سورتا ہوا محسوس ہوتا۔ چھن چھناتی مٹھی اور
 جھنجھنے سے گزر کر عمر کا کارواں لکڑی کے گھوڑے اور گیند بلے تک آپہنچا
 تھا۔ لیکن ننھا بس اس طرح جے جا رہا تھا۔ جیسے کسی چیز سے کوئی سروکار ہی نہ ہو۔
 دوڑنے بھاگنے کی عمر میں رینگنے کی کوشش کرنا اس بات کی دلیل تو نہ تھی کہ
 ساتھ کے بچے جو ان ہوں گے تو ننھا بچا رہ انکو ٹھاچوتا پھرے گا اور پھر ماں کا دل
 ماں کا دل ہے۔ دنیا اسید پر قائم ہے۔ ننھے کے ان ساری کوتاہیوں کے باوجود
 اللہ تلے تھے۔ مندروں میں دیے جلائے جاتے۔ پنڈتوں کو دان دیا جاتا۔ یہاں تک
 کہ بھگوان کے نام پر گوماتا چھوڑی گئیں۔ مندر میں دیے جلتے رہے۔ پنڈتوں
 کو دان ملتا رہا۔ گوماتا کبھی سبزی والی کی ٹوکری پر کبھی غلے والے کی بوری پر
 صف جلاتی اور بہتر کھاتی رہیں۔ لیکن ننھا بے چارہ بچوں کا توں رہا۔
 یہاں تک کہ رنگ برنگی ساریاں گھر کے برآمدے میں پھر لہرائیں۔ سرسراہٹیں
 پھر ان رنگوں کے بچوں بیچ جیتن بابو کی دھرم پتلی لجاتی رہیں۔ سمیٹتی اور سکڑتی رہیں
 پھر دیکھتے کے دیکھتے ایک اور زندگی کا اضافہ ہو گیا۔

سنے کی آمد نے ننھے کی قدر و منزلت میں بہت کمی کر دی۔ کرنے والوں نے
 یہ سب کچھ غیر ارادی طور پر کیا اور — محسوس کرنے والوں نے بھی غیر شعوری
 طور پر محسوس کیا۔ اب نہ ننھے کے وہ جو بچے تھے نہ ٹھاٹھ باٹھ جیتا جاگتا برابر کا
 حق دار پیدا ہو گیا تھا۔ جیتن بابو کی پتلی دیسے اس سے غافل نہ تھیں بلکہ وہ تو

ابھی تک ننھے ہی پر زیادہ رکھی ہوئی تھیں لیکن منا بھی تو سینے سے چپٹ کر دو دھنپتا تھا۔ جوں جوں دن گزرتے گئے منے کے کارناموں کا سلسلہ دراز ہوتا گیا۔ جو بات ننھے نے نہیں کی تھی منے نے سب کچھ کر دکھایا۔ پھر آہستہ آہستہ اس نے ماں کے دل میں اس طرح ہاتھ پاؤں پھیلانے کہ منا بیٹا منا راجہ بن بیٹھا۔ بات کہنے کی نہیں لیکن محسوس تو کچھ یوں ہی ہوتا ہے کہ دلوں کی دونوں بستیوں پر منا راجہ کی حکومت ہے جیتن بابو کی محبت کچی کھلے بندوں دیکھی اور سمجھی جاسکتی تھی۔ علانیہ معلوم ہوتا تھا کہ ترازو کا جھکاؤ کس طرف ہے، لیکن ماں کا معاملہ بڑا گہیرا ہوتا ہے حکم نکالنا مشکل ہی تھا منا کہ منا راجہ نے ننھے کو ماں کے دل سے نکال پھینکا ہے۔ کبھی کبھی کچھ ایسا اندازہ ہو بھی جاتا تو دوسرے لمحے ہی یہ بات بالکل جھوٹ معلوم ہوتی۔ کچھ دنوں سے ننھے کی صحت کچھ ادرگر گئی۔ علاج معالجہ میں جیتن بابو نے کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھا تھا۔ لیکن مایوسی اُن تھیں کہ بڑھتی ہی جاتیں۔ پھر ایک دن مختصر سی علالت کے بعد ان کی دھرم پتی سو رگباشی ہو گئیں تو جیتن بابو کچھ اس طرح دل تھامے زندگی بسر کرنے لگے جیسے ان کی پتی دنیا سے اٹھ کر ان کے من میں آبراجی ہوں۔

ننھے کے لیے انھوں نے سب کچھ کر دیکھا۔ ہر حور ماں کی تمنا تھی کہ کاشی جا کر ننھے کی صحت دباں سے مانگ لائیں۔ پندرہ توں نے بھی جب اس خواہش کو ہوا دی تو جیتن بابو بالکل پڑے پڑے تھے۔ ننھا اور مناد دونوں ہی ساتھ تھے ننھا پانچ سال کا ہو چکا تھا۔ لیکن تین سال کے منے سے دیکھنے میں کم ہی لگتا۔

اور اب ننھے نے منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی راستے میں جیتن بابو کا ساتھ

چھوڑ دیا تھا۔ مناد دوسری برتھ پران کے برابر ہی سو رہا تھا۔ اور وہ بھرے کپڑے
میں تھا تھا تنہا سے بیٹھے اس خیال سے الجھ رہے تھے کہ اپنے جگر گوشے کو رات
کی اس بھیاں تک تاریکی میں کس طرح اٹھا کر گنگا مانی لگی آغوش میں پھینک سکیں گے
وہ امانت جو مستقبل کے ہاتھوں سوہنی جانی تھی کس طرح دریا کے حوالے کی جاسکتی تھی۔
جیتن بابو کے دل میں ایک سمندر ٹھہرا ہوا تھا۔ پتہ نہیں کس کے انتظار میں
تھا یہ سمندر بالکل خاموش، ایک لہر نہیں ایک موج نہیں۔

اور گنگا مانی اپنی پوتہ کے ساتھ ان کی جانب بڑھ رہی تھی۔
انجمن مسلسل چنگھاڑ رہا تھا پنڈت جی کی باتیں انجمن کی کرخت چیخ و پکار میں
دب دب جاتی تھیں وہ کہہ رہے تھے۔

”راجہ سکر نے ایک رشی سے نازیاں برتاؤ کیا تھا۔ اس کے شراب سے
راجہ سکر کا سارا خاندان پتھر کا بن گیا۔ جھگوان کی لاکھی بے آواز ہے بھائی۔“ پنڈت
جی کا مزید لہجہ اس کے بعد سنائی نہ دیا۔ انجمن کے تازہ دم ہونے کے لیے لمحہ بھر کو
چیخ و پکار بند کی۔ تو پنڈت جی کی آواز پھر ابھری۔ دشمنوں نے بھاگرت سے کہا
کہ دکنیٹھ لوگ میں گنگا بہتی ہے۔ پر لوگ تک لے آئے گا۔ کچھ تو پتھر کی سورتیوں
میں پھر سے جان پڑ جائے گی۔“

انجمن نے باہر کی تارکیوں، سناٹوں اور پنڈت جی کے علم و دانش کی روشنیوں
کو جیسے بیک وقت ہلکا کر دیا اور اس کی چیخ و پکار میں پنڈت جی کی آواز پھر کہیں
کھو گئی۔ لیکن پنڈت جی جیسے اب انجمن کی گستاخی سے جھلا اٹھے تھے انھوں
نے بھی اپنی آواز بند کی۔

”گنگا جی اس دنیا میں براجیں اور بچھڑ کی مورتیوں میں جان پڑ گئی۔
گنگا جل امرت ہے۔ گنگا جل کلیان ہی کا شبھ نام ہے۔“

چیتن بابو گنگا مائی آپ کی خود چل کر آ رہی ہے کلیان کے لیے اس سے
سیدھا اور راستہ نہیں ہے۔ چیتن بابو، ”پنڈت جی اپنی آوازیں اعتماد
پیدا کر رہے تھے۔“

ابنجن فرائے بھڑتا ہوا گنگا کی طرف بڑھ رہا تھا۔ گنگا چیتن بابو کی طرف خود
چل کر آ رہی تھی۔

چیتن بابو کے دل میں ایک سمندر کھل رہا تھا۔ ابنجن فرائے بھڑتا ہوا۔
گنگا مائی کے سینے پر چل رہا تھا۔ ”گنگا مائی یہ کچھ چھوٹ رہی ہے چیتن بابو۔
مے میت رہا ہے۔“

چیتن بابو دیوانوں کی طرح اٹھے اور انھوں نے اپنے تحت بگھر کی لاش
گنگا میں پھینک دی۔

ایک ہلکی سی چیخ سنائی دی۔ منا اپنی برکت پر نہیں تھا اور منھے کی لاش سننے
پر کھڑی ہو گئی۔

کینڈل کا لونی

(مقام اور کردار سب کے سب قطعی فرضی ہیں اگر آپ چاہیں تو سامان کی فہرست اور لکھنے والے کو اصلی سمجھ سکتے ہیں)

اُس پیاسی اور بخر دھرتی کی مانند جس پر بادل اڑا کر چھائے تھے لیکن تیز ہواؤں نے انھیں اڑا کر کمبل دربرسنے کے لیے چھوڑ دیا ہو۔
کوئی ان محبتوں کے لیے جو دوسروں سے اس کو نہیں ملتی ہیں ترس تو سکتا ہے۔ لیکن ابا کی ایک اور محرومی تھی۔

وہ آدمی جو اپنی ہی محبت بے دریغ دوسروں پر لٹانا چاہے۔ لیکن نہ لٹا سکے یہ اسی محرومی ہے جو سناٹا بن کر آدمی کے دل میں بس جاتی ہے۔

یادوں سمجھیے جیسے بادل اڑا کر اکٹھے ہوں جھوم جھوم کر چھاتے ہوں لیکن برس ہی نہ پاتے ہوں اور ان کے وسیع سینے میں چھپا ہوا ٹھنڈا میٹھا پانی کنکر پتھر بن کر ان کے اپنے سینے کا بوجھ بن جاتا ہو۔

”ابا“ ساری کینڈل کا لونی کا ابا تھا۔ میں نے گریہ دار کے ناطے اس کی

اولاد معنوی کے انبوه کثیر ہیں ایک خاندان کی حیثیت رکھتا تھا۔ پہلے پہل جب مجھے اباسے سابقہ پڑا تھا تو اس نے مجھے کالج کے سامان کی دوکان سے اٹھائے ہوئے مٹی کے مادھو کی طرح برتا تھا مالک دوکان نے اگر کالج کے سامان میں مجھے بھی سجا دیا تو میرا کیا دردش لیکن خریدار نے مجھے ہی تصور وار ٹھہرایا کہ میں اس دوکان کا اہل نہیں تھا۔ اور میرے اس جرم کی ابانے مجھے خوب خوب سزا دی۔

میرا جرم یہی تھا کہ میں تلب شہر میں جہاں رہنے کی تمنا میں بڑے بڑے کھاتے پیتے لوگ اپنی موٹروں کے طائر گھستے پھرتے تھے۔ لیکن انھیں رہنے کو اس کالونی میں مکان نہیں ملتا تھا۔ وہاں میں موٹروں کے طائر نہیں پسے ہوئے گھستے پھر رہا تھا۔

ابانے مجھے سر سے سیر تک دیکھا تھا۔

پھیر پیرے سیر تک دیکھا۔

وہ بلا شرکت غیرے ساری کالونی کا مالک تھا۔ اولاد اس کے بچی نہیں۔ چھوٹے بڑے خوبصورت سے کوہڑے اور وہاں میں بستے ہوئے رنگ بنگے سامانوں کے درمیان کالج کے بنے ہوئے نازک نازک سے لوگ۔ یہ تھے اباس کے گریہ دار جو موٹروں میں اڑتے تھے اور فرش پر جوتے پہن کر چلتے تھے کالونی کے اسی کار گریہ شیشہ گراں میں، اپنے مٹی کے گھر دندے کا سارا اثاثہ لیے میں بھی چلا آیا۔ اور یہ سب کچھ اس وقت ہو سکا جب کہ ”ابا“ نے مجھے الٹ پھیر کر اچھی طرح دیکھ لیا کہ میں کہیں سے ٹوٹا پھوٹا نہیں ہوں۔ مجھ میں کوئی کسر نہیں ہے گھر کے لیے میری ضرورت در حاجت مندی یقیناً ایسی ہے کہ اس کالونی میں دو پورے جو بھائی کتا پڑے

اور جسے سمجھوں نے پھوڑ دیا ہے، مجھے دے دیا جاسکتا ہے۔ مجھے ”ابا“ نے اس کے باوجود تین چکر کروائے اور جب میں نے مایوس ہو کر اس سے اس ضمن میں ملنا چھوڑ دیا تو وہ خود مجھے شہر کے پرانے بازار میں اپنی لمبی چوڑی قیمتی سی کار میں بیٹھا ہوا ملا۔ خود اس کے بلانے پر میں جب اس کے قریب پہونچا تو اس نے کہا۔

کیوں صاحب آپ کو گھر نہیں چاہیے۔

مجھے ایسا لگا جیسے ”ابا سر“ راجہ کسی غریب شہر کو چھڑ رہا ہو اس کی ٹوپی اچھاں رہا ہو۔ میں باوجود کوشش کے یہ نہ کہہ سکا کہ مولانا بلا ناغہ تین روز میں کوئی آپ کے دیدار کے لیے نہیں حاضر ہوتا رہا ہوں۔ میں ایسی بات کس طرح کہہ سکتا تھا۔ لہذا میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ بس ہاتھیں کھل کر رہ گئیں میری زندگی کی ایسی ضرورت پوری ہو رہی تھی جس ضرورت کا اندازہ باری تعالیٰ کو ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ جو عرض و فرش پر، حجر و شجر پر، شیشہ و سنگ میں آب و آتش میں، خار و مغیلاں سے گل تر تک، لوگ خار میں بھی اور برگ گل میں بھی جہاں چاہے جس وقت چاہے رہ سکتا ہے تو اس کے لیے مکان کی قلت کا مسئلہ کوئی مسئلہ ہی نہیں اس لیے یہ مسئلہ تو صرف غریب بندوں ہی کے حصے میں آیا ہے جس کی نسبت آپ اسے رجوع بھی نہیں کر سکتے۔ اور اسی لیے میں نے ”ابا“ کو ایسی محبت کی نظر سے دیکھا جس سے احسان منائی بھی ظاہر ہوتی تھی۔ اس لیے کہ وہ میری زندگی کی سب سے بڑی ضرورت کو پورا کر رہا تھا جس کا وعدہ باری تعالیٰ نے نہیں کیا ہے اس لیے کہ گھر کوئی رزق تو ہے نہیں۔

اب میں کینڈل کا لوئی میں خلا کے مسافر گکارن کی طرح اس انداز سے
 وارد ہوا جیسے فاتحِ زمان و مکاں ہوں۔ اس لیے کہ میں نے ابا کا دلی جیت
 لیا تھا جس نے مجھے اپنی کا لوئی میں رہنے کے لیے ایک فلیٹ دیا ہے۔
 کینڈل کا لوئی میں مجھ سے کم درجے کا کوئی شخص نہیں تھا۔ درجے
 کا تعین میں نے موٹر اور کتے سے کیا ہے۔ قریب قریب ہر رہنے والے کے
 پاس ایک موٹر اور ایک یا دو کتے ضرور تھے۔ یہ کتے دن کو اپنے مالکوں
 غلات کا لوئی میں کانفرنس کرتے اور رات کو اس ذہنی ریاضت سے جھک
 کر اس طرح سو رہتے جیسے جانتے ہوں کہ آپس ہی میں ایک کا مالک دوسرے
 کے مالک کے گھر نقب لگانا چاہتا ہے اور ساتھ ہی ایک دوسرے سے خاف
 بھی ہے۔ کا لوئی کی تقسیم اور ہر پڑی کے بٹوارے کے سلسلے میں یہ مخالفتیں
 اتنی بڑھ گئی تھیں کہ ایک کا مالک دوسرے کے مالک سے بڑی رات کو
 اندھیرے میں نہیں ملتا تھا۔ کتوں کو باہر کے کسی راہزن کا کھٹکانہ تھا جو کبھی اپنی
 نیند خراب کر کے رکھوالی کرنے کی ضرورت پیش آتی۔ وہ جانتے تھے کہ کینڈل
 کا لوئی میں رہنے والے سارے کے سارے لوگ ان کے اپنے مالک ہی
 کی تعریف میں آتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ سب کے سب ایک ہی خاندان کے افراد
 ہیں اور اگر ان میں کوئی ان بن ہو بھی جائے تو کتے اس جھگڑے فساد میں کوئی
 رول ادا کرنے کو نہک حرامی کرتے۔ اس لیے ان میں بھی محبت اور پیار بھی بڑھ
 گیا تھا۔ مالکوں کی ہر کانفرنس کے بعد وہ اپنی کانفرنس میں اپنے مالکوں کے
 اعمال نیک دید کا نہ صرف جائزہ لیتے بلکہ انھیں ذہنوں میں رکارد بھی کر لیتے

کہتی تھی کہ ان سارے مالکوں کا آبا جیسے سرغنہ تھا۔ اس لیے بھی کہ اس کے پاس کتنے بھی زیادہ تھے اور موٹریں بھی زیادہ تھیں اور فی الوقت تو وہ ساری کالونی کا جیسا کہ میں نے کہا تھا بلا شرکت غیرے مختار کل تھا۔

شروع شروع میں جب میں کینڈل کالونی کے رہنے والوں میں شامل ہوا تھا تو سمجھتا تھا کہ دوسرے سارے لوگ بھی میری طرح ”ابا“ کے صنف کرایہ دار ہیں لیکن آہستہ آہستہ مجھے معلوم ہوا کہ ایرانی نژاد علی سین جو اپنی بیوی کو سات پر دوں میں چھپا کر رکھتا ہے اس بیوی کو جس کے جسم پر سفید چمڑی تو ہے لیکن گوشت نہیں ہے وہ ”ابا“ کا کرایہ دار ہے اور وہاں میرے فلیٹ سے بالکل متصل وہ سنی عورت بھی جو اپنے تن و قوس اور چمچہم بدن کے ہرے بدن کے بل بوتے پر اپنے شوہر کو چھو کر کہہ کر بلاتی تھی وہ بھی ”ابا“ کی کرایہ دار تھی اس عورت کا اکلوتا چھوٹا سا لڑکا بڑا پیارا سا تھا لیکن بے انتہا شریر بھی۔ وہ کینڈل کالونی کے سارے بچوں سے یکے بعد دیگرے دوستی بھی کرتا اور لڑتا جھگڑتا بھی اور جب اس کے خلاف کالونی کے بچوں کا مشترکہ محاذ قائم ہو جاتا تو وہ دوسرے بچوں سے پیٹ کر اپنی ماں سے جا چمکتا اور بین کر کے کینڈل کالونی کے سارے بچوں کی شکایتیں کرتا، پہلوان قسم کی سندھی عورت پہلے دو ہسٹراسی کی پیٹھ پر بھاڑ دیتی پھر پھری ہوئی شیرنی کی طرح اپنے فلیٹ سے نکل کر ایک ایک بچے سے لڑتی، بچوں کی ماؤں سے اکھتی بات بات پر اپنے بچے کے اکلوتے ہونے کا ذکر کچھ اس طرح کرتی جیسے یہ اس کی بد نصیبی نہیں بلکہ کوئی ناقابل انکار رانما ہے جو اس نے صرف ایک کچھ جانا اور پھر اپنے شوہر کو چھوڑے پکارنے لگی۔

”تمھارے دو ہیں — میرا تو ایک ہی ہے“

”تمھارے تین ہیں — میرا تو ایک ہی ہے“

”تمھارے کتنے سارے ہیں — میرا تو ایک ہی ہے“

ایک انسپکٹر کی بیوی نے جو اس کالونی میں موٹر کی بجائے موٹر سیکل پر رہی، اکتفا کرتا تھا سندھی عورت سے ایک دن کہا۔

بہن جی — تمھارا ایک ہی ہے تو دوسرا چپکے سے پیدا کیوں نہیں کر لیتیں۔ کالونی بھر میں چھیتی پھرتی ہو میرا ایک ہی ہے۔ مجھے تو ایک ہی ہے۔ تم کہو تو اپنے شوہر کو خدمت کے لیے حاضر کر دوں۔

وہ تو خیر گذری جو سندھی عورت نے بات نہیں سمجھی درنہ انسپکٹر کی بیوی بیماری تو یوں بھی چلتی کیا کھتی ہواؤں میں ڈولتی کھتی اور وہ بھی اس طرح جیسے پتنگ تھا پکھاتی ہو، سندھی عورت کے انتقاماً دو چار برس سے بھی اس کی جان لینے کے لیے کافی تھے لیکن سندھی عورت نے یہ بات سنی نہیں یا پھر سن کر سمجھی تھیں۔

کینڈلی کالونی کی ایک اور مشہور شخصیت جو ساری کالونی کے ذہنوں میں رات کی گہری تاریکی کے ساتھ ساتھ ابھرتی کھتی اور پو پھٹتے سئے اجالوں کے ساتھ ٹوہڑ جاتی تھی وہ انسپکٹر کے چھوٹے بھائی کی ہستی تھی، یہ ایک معمولی سا لونڈا تھا جو ابا کا قریبی رشتہ دار ہونے کے ناطے ساری کالونی کا رشتہ دار تھا لیکن بغیر کسی اجازت کے ہر گھر میں بلا جھجک داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ سندھی عورت، ایرانی غلام حسین، دودھ دالے غفورے میاں اور مجھ سے اس کا کوئی رشتہ نہ تھا۔ ویسے ساری کینڈل کالونی سے اس کا ناطہ یقینی تھا، یہ لڑکا ہندوستان بھر میں پھر کر گھاٹ گھاٹ کا

پانی پیتا رہتا لیکن روٹی کے انتظام کے لیے کینڈل کا لونی ہر دوسرے تیسرے مہینے ضرور آتا اور اندھیرے کی طرح لوگوں کے ذہنوں پر بچھا جاتا۔ کینڈل کا لونی کا ہر گھر اس کا کفیل ہوتا اور وہ اس طرح کہ وہ اسی کا لونی میں وقفے وقفے سے ہر گھر میں ہاتھ صاف کرتا رہتا مال مسروقہ کی قیمت کا لحاظ کرتے اس کی سیاحی کی مدت مقرر ہوتی۔ کینڈل کا لونی سے قدم باہر نکال کر جب اس نے قرب و جوار میں بھی اپنی ہاتھ کی صفائی کئی مشق کا آغاز کیا تو انسپکٹر بچارہ سرکاری وردی سے سرکاری پٹن نکال کر سرکاری جوتوں سمیت اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا اور اپنے فرض کی ادائیگی میں بھائی ہونے پر بھی کوئی کسر اٹھانہ رکھی۔ اور اسے اچھی طرح تنبیہ کر دی کہ جو کچھ کرنا ہو بس کینڈل کا لونی ہی میں کیا کرے۔ اس لیے کہ کا لونی کا ہر گھر اس کا اپنا گھر ہے وہاں کے رہنے والے اس کے اپنے لوگ ہیں ان کی ہر چیز اس کی اپنی ہے۔ خدا معلوم اس لونڈے کو اس بات کا پتہ کیسے چل گیا کہ میں بھی کینڈل کا لونی کے مالک کو جو ساری کا لونی کا ”ابا“ ہے ”ابا“ ہی پکارنے لگا ہوں بس اتنا معلوم ہونا تھا کہ اس نے میرے گھر کو بھی اپنا ہی گھر سمجھا اور ان دنوں جب میں ملازمت کے سلسلے میں دورے پر کسی ضلع کو گیا ہوا تھا۔ گھر کے بچے جھکے ایک روشن دان سے داخل ہو کر جو بھی اسے مل سکتا تھا اٹھالے گیا۔ اس سر در قہ سامان کی فہرست میں نیچے اس لیے درج کر رہا ہوں کہ اگر آپ یہ سامان برآمد کرنے کے لیے آمادہ ہوں تو سب کا سب میں آپ کی نذر کر دوں۔ میں آپ کی اتنی مدد کر سکتا ہوں کہ اس لونڈے کا ہاتھ پکڑ کر آپ کے ہاتھ میں دیدوں سامان اس سے آپ اگوائیں اور خوشی سے اپنے گھر میں محفوظ رکھیں اور یہ کام آپ بہت آسانی

سے کر سکتے ہیں بشرطیکہ آپ کا گھر یا فلیٹ کنیڈل کا لونی میں نہ ہو اور آپ ”ابا“ کے رشتہ دار نہ ہوں۔ اور یہ لونڈا اسی رشتے والی کے سہارے ہمیشہ بچھا گیا ہے۔

سامان کی فہرست یہ ہے۔

ایک کن زلیے، جرمین ٹیبل کلاک، ایک اگیل تھر موس۔

ایک پاندان جرمین سلور، ایک عطر دان، ایک کافی سیٹ، ای۔ پی۔ این۔ ایس۔ ایک گانگل، ایک نمبری عینک، ۲ پتلون، ۳ شرٹ، ایک انڈین پاکٹ فونٹن پن۔ الشجاع کے تین اور چارٹرے و نقش کے دو دو پرچے، داستان گو کا کہانی نمبر اور ادب لطیف کا سالنامہ، ایک اردو کتاب، باب بیٹے (ترکیفت) ایک انگریزی کتاب یا مادی ہل ہول (الگز نڈرا کو پرین) گیارہ سگریٹ کی ڈبیاں جن چھ خالی ہیں، سوڈے کے تین شیشے جن میں ایک بھرا ہوا تھا۔ سولن دھسکی کا ایک بپ جو میں نے پینے کے لیے نہیں تفریگا رکھا تھا اور بھی کچھ ہوگا جو مجھے اس وقت یاد نہیں۔

دودھ والے غفورے میاں کے متعلق تو میں نے آپ کو کچھ بتایا ہی نہیں، مڑے ہوئے سینگوں کی چکنی چپڑی سیروں دودھ دینے والی کئی بھینسیں غفورے میاں کا کاروبار بڑھانے کے لیے خود شہیر کا باعث تھیں۔ لوگ ان بھینسوں کو دیکھ دیکھ کر ہی ان کے دودھ کا تصور کر لیتے اور ان کی نظروں میں ملائی اور مکھن سے بھری قابیں سما جاتیں۔ غفورے میاں بڑی احتیاط اور اہتمام سے دودھ لگا بھوں کے سامنے ہی دو ہوتا اور اس کا یہ ہنر کوئی دیکھ بھی نہ پاتا کہ اپنی کمر کے

گمرد بیٹے ہوئے سائیکل کے ٹیوب سے جو پانی سے بھرا ہوتا رہا بڑکی نالی لگا کر وہ کس طرح دودھ میں میٹھا اور شفاف پانی ملا دیتا ہے۔

انکپٹر کے فیلٹ کے پچھلے حصے میں دو بوڑھیاں بڑی کس پرسی کے عالم میں رہتی ہیں یہ ”ابا“ کے مرحوم بھائیوں کی نشانیاں ہیں جنہوں نے کبھی اچھے دن ضرور دیکھے ہوں گے لیکن اجالے سے اندھیرا جس طرح بھاگتا ہے آج کل ان بوڑھیوں کے اچھے دن اسی طرح ان سے بھاگتے رہتے ہیں در اس بھری پری کینڈل کا لونی کی دنیا میں جہاں موٹرروں کی چکا چوند ہے یہ دونوں بوڑھیاں اپنی تین چار بطلوں، چار چھ مرغیوں اور ایک سیاہ بکری کے پیچھے صبح سے شام تک بڑے خشوع و خضوع سے اس طرح مصروف رہتی ہیں جیسے جانتی ہوں کہ کینڈل کا لونی کے سارے افراد خاندان انھیں بطلوں اور مرغیوں کے سہارے چمکتی موٹرروں تک پہنچانے ہیں۔ یہ دونوں بوڑھیاں انسانوں کی بستی میں روحیں معلوم ہوتی ہیں جو اپنا ماضی ڈھونڈھتی پھر رہی ہوں۔

”ابا“ نے غفور میاں کے پاس ایک بھینس خرید کر چھوڑ رکھی ہے وہ معاوضے میں روزانہ تین یا دو دودھ ”ابا“ کو دیتا ہے اور نصف سیر دودھ کا ”ابا“ نے ان بوڑھیوں کے لیے بندوبست کر دیا ہے ایک دو سکر کی نظر بچا کر یہ بوڑھیاں کبھی کبھی اپنے حصے سے زیادہ دودھ پی جاتی ہیں اور پھر لڑائی شروع ہو جاتی ہے۔ دونوں ہی کے مرحوم شوہران کی اپنی قبروں سے اٹھائے جاتے ہیں پھر سلائے جاتے ہیں پھر اٹھائے جاتے ہیں۔ پھر دونوں ہی مل کر رونے کے لیے بیٹھ جاتی ہیں۔ لیکن دوسرے دن دودھ کا راتب ملنے سے پہلے دونوں شیر و شکر

ہو چکی ہوتی ہیں درابا کے دودھ میں سے پائے بھر دودھ نکال کر اتنا ہی پانی ملا دیتی ہیں۔
میرے فلیٹ کے بائیس ابا کا ایک اور قریبی رشتہ دار میجر رشید الدین خاں
رہتا ہے یہ غالباً ”ابا“ کے کسی مرحوم بھائی کی چیمینی بیٹی کا چھتا شوہر ہونے
کے ناطے ”ابا“ کو بھی پیارا ہے۔

ابا کو ویسے کالونی کا ہر فرد پیارا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کالونی
کسی بھی فرد کو ”ابا“ کے پیارا اور محبت کی ضرورت نہیں ہے اور جس چیز کی
ضرورت نہیں ہے وہ ابا جانتا ہے لیکن ”ابا“ اصولوں کا آدمی ہے وہ وقت
کے انتظار میں ہے تاکہ ان لوگوں کو وہ ساری چیزیں دیدے جن کی قیمت ان
کی نظروں میں ابا کے پیار سے کہیں زیادہ ہے۔

میں تو آپ کو میجر رشید الدین خاں کے متعلق بتلا رہا تھا کہ ابانچ میں دھکا
”ابا“ کی شخصیت ہی کچھ ایسی سن موہنی ہے کہ آپ کینڈل کالونی کا ذکر کس کس تو
اس کالونی کے چپے چپے پر ابا چھایا ہوا نظر آئے گا۔ گھر گھر میں ابا کی پہچائیں
دکھائی دے گی ”ابا“ کی جو مرکزیت ہے وہ کچھ اس طرح کی ہے کہ ابا کے وجود
کو کینڈل کالونی سے ہٹا لیجیے تو اس ساری کالونی کے یقیناً پرچھے اڑ جائیں گے
اس کالونی کے حدود میں ایک آدمی دوسرے آدمی کی صورت بھی نہیں
پہچانے گا۔ کاغذ قلم اور برچھے بھالے لے کر لوگ کالونی کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے
اس کا بٹوارہ کر لینے کے لیے بھی ایک دوسرے پر چھبٹیں گے، کبھی عدالت کا دروازہ
کھٹ کھٹائیں گے۔ عدالت کے دروازے کی مماثلت سے ہی میں نے اس
ہنگامہ آرائی کی فضا میں کاغذ اور قلم کا بھی نام لیا ہے ورنہ کاغذ اور قلم کا یہاں

کیا کام۔ میں کہنا کیا چاہتا تھا کہ ابا کا وجود ہٹ جائے تو پھر اس انفرادی
 اس بعض خاندان اس آتش و بار دت کی فضا میں جہاں بھائی بھائی کو دیکھ کر
 مسخ پھیر لیتا ہے۔ جہاں خاندان کی بڑی بوڑھیاں کھنڈروں سے آئی ہوئی
 روجوں کی طرح اپنا ماضی تلاش کرتی پھرتی ہیں وہاں آدمی آدمی کو کس طرح
 پہچان سکتا ہے اور میرے کان آنے والے وقت کے وہ دھماکے سن رہے
 ہیں جب کینڈل کا لونی بالکل جوں کی توں دھری رہے گی لیکن وہ حرارت
 اس سے چھین جائے گی جو زندگی کا دوسرا نام ہے اس میں پارک ہونے والی
 موٹریں اپنے اپنے لیمپ جلا کر ایک دوسرے کو گھوریں گی لیکن پہچان نہ پائیں
 گی کا لونی کے کتے ایک جگہ جمع ہو کر کانفرنس کریں گے اور جب انھیں موت کے
 سے سنٹے ساری کا لونی میں رہینکتے ہوئے نظر آئیں گے تو وہ انھیں سناٹوں
 سے بھوں بھوں کرتے زندگی کی بھیک مانگیں گے ابھی میری کینڈل کا لونی کے
 ”آدمی باسیوں“ کو یہ نہیں معلوم ہے کہ ایک ”محبت“ کی موت ایک ”معاشرے“
 کی موت ہوتی ہے اور اسی موت و زندگی کے درمیان ابا کا وجود کج تک
 ایک ربط باہمی بنا ہوا ہے بالکل اسی طرح جیسے ساری کا لونی کے ”آدمی باسی“
 کسی گہری گھاٹی کے اٹوٹ اندھیروں میں کا لونی سمیت ڈوب جانے کے لیے
 اپنا سارا اندر باند لگا رہے ہوں صرف اس تصور میں کہ اس کھائی کی تہ
 میں جواہرات کی ڈھیریاں چھپی ہیں اور ابالے چارہ تین تنہا ساری کینڈل
 کا لونی کو ایک مضبوط رسی میں باندھے کھائی کے کنارے کھڑا ہوا کا لونی کو اوپر
 اٹھانے کے لیے آنسو بار اپنا سارا اندر اپنی ساری قوت لگا رہا ہے۔ لیکن

رسی ٹوٹ جانے کا ڈر ہے۔ مجھے ایک ڈر اور بھی ہے۔ رسی ٹوٹنے سے پہلے ہی اگر ابا کا سانس ٹوٹ جائے تو۔ اس لیے کہ وہ تین تنہا کنارے پر کھڑا لپ رہا ہے اور اس کے دست باز دشل ہو گئے ہیں۔ میں پھر کہاں سے کہاں نکل آیا ہوں۔ میں تو آپ سے میجر رشید الدین خاں کی بات کرنے چلا تھا میجر رشید الدین خاں کا لونی بھر میں سب سے مقبول ہے مرجان مرغ شخصیت کا مالک ہے آپ اس سے سوائے ادب کے کسی بھی عام موضوع پر بات کر سکتے ہیں۔ وہ کج کل مختلف قسم کا بزنس کرتا ہے آدمی تیز ہے زمانے کے سر دگر دم کا شعور رکھتا ہے کالونی کی پراپرٹی پراپرٹی پر اپنے معمول کی بنیادیں نہیں رکھتا۔ پولیس کچن کے بعد اس کو حیدر آباد کچہری سے علاحدہ کر دیا گیا تھا لیکن آج فوجی انسر کی کوئی نشانی اس میں باقی نہیں ہے۔ میں نے اتنا وسیع الملاقات آدمی کم ہی دیکھا ہے بھانت بھانت کے لوگ اس سے ملنے کے لیے آتے ہیں کسی کے ملنے جلنے والوں کو دیکھ کر اس کی اپنی انفرادیت کے تعلق سے کوئی رائے قائم کی جاسکتی ہے لیکن رشید الدین خاں کا معاملہ ہی دوسرا ہے اس لیے کہ اس کے پاس دوست اور اہل معاملہ کچھ ایک ہی ڈھب سے آتے ہیں تالی بگتی ہے اور میجر کھر کی سے سر نکال لیتا ہے ایک بار ایک رکشہ میں ماہی بے آب کی طرح ترہتی ہوئی ایک عورت میجر کے پاس لائی گئی تو میں حیران ہو گیا۔ لیکن کچھ ہی دیر بعد میں نے دیکھا کہ میجر چھری ہاتھ میں لیے سورج کی جانب رخ کیے آنکھیں بند کیے جھوم جھوم کر کچھ پڑھ رہا ہے اور چھری پر کچھ نک مار کر نہایت احتیاط سے عورت کے ننگے پیٹ پر چلیے بنا رہا تھا جو بن نہیں رہے ہیں اس لیے کہ عورت

کا پیٹ کوئی کاغذ نہیں ہے اور میجر کی چھری بھی کوئی تلم نہیں ہے۔ لیکن وہ جوں جوں ایسا کرتا جا رہا ہے عورت کی تڑپ سکون سے بدل رہی ہے۔

میجر رشید الدین نے دوسری جنگ عظیم میں سنگاپور میں جاپانیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو کر جو زندگی گزار دی ہے اس کی داستان حتیٰ طول ہے اتنی ہی دردناک بھی ہے۔ فی الوقت اتنی بات ذہن میں رکھیے کہ میجر رشید الدین خاں جس کے چہرے کو دوسری جنگ عظیم نے مسخ کر رکھا ہے موت سے اس طرح آنکھیں ملاتا رہا ہے کہ موت ہمیشہ اس کے آگے چل چلی رہی ہے۔

کینڈل کالونی کی خصوصیات کو آپ کے سامنے رکھنا میرے لیے بڑا مشکل مرحلہ ہے اس کالونی میں مجھے قدم قدم پر محبتیں ملی ہیں چھوٹوں سے بڑوں سے ہم عمروں سے لیکن اس کے باوجود ان انجبتوں کو محبت کہتے ہیں ڈرتا ہوں اور مجھے معلوم ہے کہ کینڈل کالونی میں ساری محبت کی عمر بھی ایک ساعت و دیدار سے کم ہوتی ہے جب کہ ایک ساعت دیدار اسی جہاں میں ساری عمر کی محبت ہو سکتی ہے لیکن میں ان مختصر ترین محبتوں کو ملول دینے کا گرجا جانتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ ان محبتوں میں اگر کوئی شے حال ہے تو کینڈل کالونی خود ہے اپنی شتر کہ جائداد کی صورت میں یہ کالونی یہاں بسنے والے افراد خاندان کے دلوں میں ایسے انگلشن لگا رہی ہے جن سے محبتوں کے نشے اتر رہے ہیں آدمی کے اندر ڈھکے چھپے ایسے جذبے بیدار ہو رہے ہیں جو محبت کی عمر کو گھٹاتے ہیں اور اسے آہستہ آہستہ بڑے سلیقے سے قتل کر دیتے ہیں۔

ابا کا ایک چھوٹا بھائی ہے جسے کالونی کے اکثر لوگ چچا پکارتے ہیں ابا کے اور اس چچا کے درمیان کینڈل کالونی سے زیادہ حائل ہے ابا جس سمت دیکھتا ہے چچا اس سمت دیکھتا ہی نہیں اس لیے کہ اس مرکز پر جنہیں دونوں ایک ساتھ دیکھ رہے ہیں دونوں کی نظریں جالمتی ہیں لیکن چچا کی بیوی جسے کالونی کے سارے لوگ چچی نہیں پکارتے بڑی ہی سبھ دار اور طرحدار عورت ہے ”ابا“ اور ”چچا“ کی مخالفتوں کے باوجود وہ بزرگ ہونے کے ناطے ابا کا بڑا احترام کرتی ہے۔ مجھے اس کالونی میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لوگ ایک خوبصورت سے خان میں ہر سے کو سجا کر ابا کی خدمت میں پیش کرتے ہیں تاکہ اس سجادے کے نیچے ابا کی نظر نہ جاسکیں۔ چچا کی بیوی جسے سب چچی نہیں کہتے کچھ اسی قسم کا رول دوسروں سے زیادہ ہی ابا سے ادا کرتی ہے۔

چچی کی بیٹی کا حسن کالونی کے باہر بھی دور دور مشہور ہے۔ اس شہرت میں سچ پوچھے تو چچی کی بیٹی کے حسن کو دخل کم ہے اور شخصیت کو زیادہ بعض شخصیتیں کچھ اس طرح حاذب توجہ ہوتی ہیں کہ انہیں دیکھتے رہنے میں آنکھوں کو بڑا بھلا معلوم ہوتا ہے۔ غور کیجئے تو ان میں وہ کشش ان کی غیر معمولی حسن کی بنا پر نہیں ہوتی جب کہ وہ اتنی حسین ہوں ہی نہیں سکتی چچی کی اس بیٹی کا حسن اس کی وضع داری اور پندار کے باعث نکھر رہا ہے وہ نظریں جو دنیا بھر کو دیکھ لینے کا جتن کرتی ہوں کہیں اپنی ”نگہ“ کو بقول غالب بظاہر نگاہ ”بننے نہیں دیتیں۔ کالونی کی حسیہ دلنواز کالونی کے ابا اور کالونی کے چچا یعنی اس کے اپنے ابا اور اس کے اپنے چچا کے نفاق کو بھی اسی نگاہ غلط انداز سے دیکھ کرتی ہے جیسے راہ میں بڑے طالب دیدار کو۔

”ابا“ کے وہ دن سنہرے دن تھے جن دنوں ”ابا“ کی چہیتی بیوی زندہ تھیں ابا کو اس ایک ہفتی میں دنیا بھر کی محبتیں مل گئی تھیں۔ اس معمولی شکل و صورت کی عورت نے واقعی کالونی بھر کے دلوں پر حکومت کی تھی ابا تو ظاہر ہے ایسے میں فاتح نہ نہ تھا جس نے اس عورت کا دل جیت لیا تھا جس کے قہقہے میں اس کے ہر چھوٹے ٹپٹے ملنے والے کا دل تھا۔ لیکن جب اس عورت نے زندگی ہی سے ناٹھ توڑ لیا تو اس کے بے پناہ اشار و محبت نے ”ابا“ کے دیران دل میں محرمیوں کی ایک دنیا آباد کر دی۔ اور اب ابا ہر چھوٹی محبت کے پیچھے آنکھیں بند کیے دیوانہ وار دوڑتا نظر آتا ہے اور وہ ساری محبتیں جو کینڈل کالونی کی سونا گلنے والی جاں نداد کے سہارے آج تک جوں توں زندہ تھیں بیمار ہو کر آخری سانسیں لے رہی ہیں تو ”ابا“ بوکھلا گیا ہے وہ کالونی کے سناٹوں میں پازیکے پھنکا کوں کو سننا چاہتا ہے وہ دہرائیوں میں زندگی کی ہما ہی کا متلاشی ہے وہ کینڈل کالونی میں ایک ایسا دیا جلانے بیٹھا ہے جس کی جوت کالونی کے ہر رہنے والے کو دوسرے رہنے والے کے دل کا راستہ بتا سکے۔ لیکن لوگ اس جوت کے سہارے ایک دوسرے کے دل میں داخل ہونے کی بجائے ایک دوسرے کے دل سے نکل کر کالونی ہی میں جمع ہو رہے ہیں۔

جب کبھی ابا یہ دیکھ لیتا ہے کہ اس نے جو دیا جلا رکھا ہے اس کی لوائے سارے کالونی کے رہنے والوں کی یورش سے کانپ کانپ اٹھتی ہے تو وہ ان سبھوں کو ساتھ لے کر کینڈل کالونی ہی سے بھاگ کھڑا ہوتا ہے سیر و تفریح کیلئے نئے نئے دل کش مقامات پر ان سب کو لے جاتا ہے بے دریغ خرچ کرتا ہے

ہنسی خوشی مسکراہٹیں، تہقیر، ترنگ، دلوے، غل غیاڑہ، کھیل تماشے۔ کالونی کا چھوٹا بڑا ہر شخص جب اس کے اطراف خوش اور مطمئن ہوتا ہے تو ابا کے چہرے کا روپ دیدنی ہوتا ہے وہ سترپا ایک دیا بن جاتا ہے جس کی بتی تیل کے آخری قطرے کے سہارے جل رہی ہو۔ لیکن اپنی اس پل بھر کی روشن زندگی سے مطمئن ہو جس کے اطراف پر دانے رقصاں ہوں۔

”ابا کے بعد کینڈل کالونی کا جو کچھ ہو گا وہ تو میری نظر میں ہے
لیکن ”ابا“ کے بعد اس ابا کا کیا ہو گا جو کبھی نہیں مرے گا۔“

ایک روز میرا بدن شدید تپ سے پھنک رہا تھا ان دنوں گرمیاں شدید پڑ رہی تھیں۔ ابا میری عیادت کو آیا اپنے ایر کنڈیشنڈ روم سے نکل کر میرے فلیٹ آتے آتے اس کا چہرہ تازت سے دکھا کھٹا تھا۔ اس نے خیر خبریت پوچھی اور میرے پاس بیٹھ گیا تو میں نے پنکھا اس کے ہاتھ میں تھا دیا کہ وہ شدید گرمی کو نہیں۔ گرمی کے احساس کو دور کر سکے۔

کہنے لگا یہ فلیٹ تو بھٹی کی طرح تپتا ہے اس فضا میں بھلا تم کیا تندرست ہو سکو گے۔

میں نے ازراہ مذاق کہہ دیا آپ ہی کا تو فلیٹ ہے ایک بجلی کا پنکھا یہاں بھی لگا دیکھیے نا۔ ساری کالونی میں میرا ہی ایک فلیٹ ہے جو پنکھے سے محروم ہے۔ شام کو اس کا موٹر فلیٹ کے سامنے لگا تو وہ خود ٹیبل فین اٹھا کر بیٹھ گیا۔

چڑھ رہا تھا۔
اور کچھ ایسی پریشاں نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا جیسے پنکھا میرے

فلٹ میں نہیں بلکہ اسمگل کیا ہوا مال سرحد پار پہونچا رہا ہو۔
 لوٹنے لگا تو بڑی بھاجت سے مجھ سے کہنے لگا۔ کسی سے بتانا مست کہ یہ پنکھا
 میں نے تمہیں دلایا ہے۔

کیوں نہیں بتاؤں گا۔ یہ تو آپ کی عنایت ہے۔ میں نے اصرار کیا۔
 ”میرے لوگ برا مانستے ہیں۔“ وہ سکرایا۔ پنکھے پر صرف کی ہوئی
 رقم محفوظ رکھی جاتی تو میرے بعد کل تقسیم میں انھیں کس کام آتی۔
 ”سمجھے کچھ۔“



اندھیروں کی لاج

بخت افروز نہ جہاں ساری بیگیوں کی سرتاج تھیں۔ زمانے نے انھیں اور
 اکھوں نے زمانے کو اچھی طرح دیکھا اور پرکھا تھا۔ جہاں کے بہار کے دن تھے تو
 سارے شہر میں ان کا نام چلتا تھا۔ مدح و ستی تھیں کہ بڑے بڑے نواب زادوں
 سے ذرا سی بات پر چٹکائیں ہو جاتیں۔ بگڑ جاتیں تو منانے والے سو سو طرح سے ملتے
 انٹرمیاں نے صورت دی تھی۔ آواز دی تھی اور پھر بڑی بات یہ کہ ترکے میں دولت
 بھی خاصی دی تھی۔ کسبیاں یوں تو شہر میں بہت سی تھیں۔ لیکن بخت افروز جہاں
 چوٹی کی طوائفوں میں بھی سمجھے جاتے کہ ماؤنٹ ایورسٹ تھیں جن کو کسی تین سٹکھیا لاری
 نے فتح نہیں کیا تھا۔

نواب اور نواب زادے افروز جہاں اور فیروز جہاں کے طائفے کی باتیں،
 بڑے تکبر سے کرتے۔ افروز جہاں اور فیروز جہاں دونوں بہنیں تھیں لیکن افروز جہاں

کی بات ہی کچھ ادر تھی۔ افروز جہاں سے اپنے معاشقے کی داستانیں سناتے پھرنا۔
 اہل ثروت کے لیے باعث فخر تھا۔ جہاں نواب زادوں نے افروز جہاں کے نام کے
 ساتھ کھوڑی بہت شہرت پائی تھی۔ ان کا مقول ہونا مسلم تھا وہ خود اس بات
 پر اترتے تھے کہ شہر کی سب سے بڑی طوائف کے خلو ت کدہ کو انھوں نے اپنی بھری
 جوانی کی دولت سے مزین داراستہ کیا تھا۔

دو ایک جن کی زیادہ شہرت تھی ان کا عالم تو یہ تھا کہ کوکھوں سے گزرتے وقت
 نظر اٹھا کر کسی دوسری حسینہ کی طر ت دیکھ لینا بھی خلاف شان سمجھتے تھے بستی پھر
 میں نظر میں اٹھتیں آہستہ آہستہ ہونٹ ملتے۔ پھر انگشت نمائی بھی ہوتی۔ آج کل
 افروز جہاں نواب صاحب پر بہت ہر بان ہیں خدا خیر کرے۔ بھئی افروز جہاں
 کے نام لیوا ہیں۔ لکھو بستی تو ہوں گے ہی لیکن وہ دن دور نہیں ہے کہ چاک باب
 کے لیے آنکھیں ترس جائیں گی صاحبزادے کی۔ یار قسمت والا نکلا لوٹا سیتے
 ہیں اٹے نوازی ہے۔ واہ صاحب کس نے کہہ دیا ہے۔ اس کو بھلا کیا نوازا
 گی۔ ابن فلاں ہے ابن فلاں۔ اور پھر جوانی بھی کیا نکالی ہے۔ افروز کی
 بیٹی ہوئی تو جوڑ تھا اس سے۔ عمر کا تفاوت بھی تو ایک چیز ہے۔ بس
 خدا ہو گئی ہوں گی افروز جہاں بھی۔ کس ہے۔ جاہ و ثروت کی کمی نہیں ہے
 — ابن فلاں ہے۔ ابن فلاں —

لیکن افروز جہاں بھی لاکھوں میں ایک سمجھی جاتی تھیں۔ لاکھوں میں ایک
 نکلیں بھی۔ لکھ بستی سیٹھ ابن فلاں کو چھوڑ چھاڑ کر وہ بس ایک مفلس شاعر کی
 ہور ہیں۔ ادھر یہ سب کچھ اس تیزی سے ہوا کہ سارے عاشق بس دیکھتے دیکھتے

یہ گئے۔

راتوں کو افروز جہاں کے کوٹھے کا طواف کرنے والوں نے شاعر کے کینچ نقس کو کھوج نکالا۔ لیکن افروز جہاں بھی پانی کی عورت تھیں۔ بے پردگی گوارا نہ کی۔ کہلا بھیجا کہ جس افروز کے لیے آپ یہاں آئے ہیں، اس کو میں نے اپنے ہاتھوں ”ہندی محبوب“ میں دفن دیا ہے۔ اور جو بخت افروز جہاں اس چھوٹے سے مکان میں رہتی ہے اس کے پاس اس کا اپنا کچھ بھی نہیں ہے اب اس کا سب کچھ ملک کے مشہور شاعر تسکین سردی کی ملکیت ہے۔ اللہ بس باقی ہو۔

افروز جہاں سے ملنے والوں میں ہر درجہ کا عاشق تھا۔ ایسا عاشق بھی تھا جو بس تعلقات نبھا رہا تھا۔ افروز جہاں گھر بیٹھ گئیں تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور وہ آنا ہوا ہر کوٹھے کی چوکھٹ پھلانگنے لگا۔ ایسا عاشق بھی تھا جو کسی صنوجا چڑیا کو حالت نشہ میں ”افروزی“ پکار کر ہی خوش ہو جاتا۔

ایک عاشق نے افروز کی یاد میں فیروزہ پر قناعت کر لی۔ لیکن فلاں ابن فلاں نے مشہور شاعر تسکین سردی کے گھر کا طواف نہ چھوڑا، اور ایک رات جب کہ شاعر دولت داد و تحسین سے مالا مال ہو کر ٹری رات کو ایک مشاعرے سے لوٹ رہا تھا عین گھر کے قریب لوگوں نے ایک دلہن کو چھ سنی۔ چرخ سننے والے جب شاعر کے گھر کے قریب پہنچے تو انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ خون آلود لاش سے چمٹی ہوئی افروز جہاں گلی میں لوٹ رہی ہے۔ اس کے دونوں ہاتھ، اس کا چہرہ، اس کے بال خون میں رنگ گئے ہیں۔ وہ عالم نیم بیہوشی میں مسلسل

بڑا بڑا رہی ہے۔ اپنے خون آلود ہاتھوں کو دیوانوں کی طرح غور سے دیکھ
 دیکھ کر چوم رہی تھی۔ یہ تمھارا خون ہے۔ تم بہت بلند ہو۔
 — تم عظیم ہو۔ یہ تمھارا خون ہے۔
 افروز جہاں بے ہوش ہو گئی۔

شاعر کو کس نے قتل کر دیا، یہ سارا آج تک راز ہی ہے۔ نواب صاحب
 بھی کچھ کم غمزہ نہ رہے۔ کیوں کہ شاعر ان کا بھی دوست تھا۔ یہ ادبیات
 ہے کہ پولیس کے چند افسروں سے نواب صاحب کی تحلیف میں ملاقاتیں رہیں۔
 قریب قریب نواب صاحب کچھ کم ہی سکرا سکے، پھر یکایک وہ بہت خوش
 رہنے لگے۔ ان کے چار ایسے صاحب جو ہمیشہ نواب صاحب کی پیشانی میں
 رہتے تھے آہستہ آہستہ بھر ڈیوڑھی میں آنے لگے جو کچھ دلوں سے پتہ نہیں کہاں
 غائب رہتے۔

الشہر رکھے نواب صاحب کی ڈیوڑھی کی چیل پہل، ڈیوڑھی کی عظمت، ڈیوڑھی
 کی زندگی سب کچھ نواب صاحب ہی کے دم قدم سے تھی۔ شاعر کے قتل کے
 بعد وہ کیا اداس ہوئے کہ ساری ڈیوڑھی پر اداسیاں سلط ہو گئیں۔ اب
 وہ مسکرا رہے تھے تو ساری ڈیوڑھی کھلکھلا رہی تھی۔

شہزادی بیگم بڑے گھر کی بیٹی تھیں۔ اطلس کوٹاٹ کا پیوند تو لگانا تھا جو نواب
 صاحب دوسری بیگم کی طرح شہزادی کو بھی اس طرح نظروں سے گرا دیتے
 جس طرح وہ دل سے دور ہو گئی تھیں دل کی بات اور تھی دل ہی تھا، اور
 وہ بھی نواب صاحب کا۔ اس نگری میں، اس بستی میں جو بس جاتا۔ بس

جاتا۔ اور جس کے لیے اس نگری کے دروازے بند ہو جاتے تو پھر نہ کھلتے۔
 لیکن شہزادی بیگم کو دل سے دور کرنے کے بعد ان سے نظر میں بھی پھیر لینا نواب
 صاحب کے بس کی بات نہ تھی حالاں کہ وہ دل ہی دل میں شہزادی بیگم سے نفرت
 کرنے لگے تھے۔ لیکن شہزادی نہ صرف نواب صاحب کی پہلی بیوی ہی تھیں
 بلکہ اسی گھر کی بیٹی بھی تھیں۔ باجے، بارات، جلوے، مانجے سے آئی تھیں۔
 دوسری بیگم کا نواب صاحب نے ہاتھ پکڑ لیا تو وہ سر پر آ بیٹھیں۔ ہاتھ چھوڑ
 دیا تو بکھی ہوئی مسندوں کو لپیٹ سمیٹ کر نہایت احتیاط سے ہر ایک نے
 اپنے دل کے نہاں خانے میں انھیں چھپا رکھا۔

شہزادی کا ہاتھ نہ تو نواب صاحب نے تھاما تھا اور نہ ان کے بس میں
 تھا کہ اس ہاتھ کو بے دردی سے جھٹک دیتے۔ مرحوم نواب برکت جنگ نے
 بہو کا ہاتھ بیٹے کے ہاتھ میں دے کر جنم جنم کے لیے شیر و شکر رہنے کی قسمیں
 دی تھیں کیوں کہ بہو شہزادی ان کے بہت چہیتے مرحوم بھائی نواب صلابت
 علی خاں کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ نواب صلابت علی خاں تھے بھی بڑے خوبیوں
 کے مالک۔ خاندان بھر میں کوئی بھی ایسا شخص نہ تھا جو ان کا شاکی ہو۔ سب
 ان کی تعریفیں کرتے۔ بہت منکسر المزاج، خلیق اطیع مرخاں، مزاج ہمیشہ
 پان کی خوشبودار پیک سے بانچھیں سرخیوں میں بھگی رہتیں۔ کبھی کسی نے جبین
 بر جبین نہیں دیکھا۔ اور موت تھی تو کس قدر اندوہناک تھی ان کی۔ برکت
 جنگ مرحوم کے دل پر جیسے بجلی گزرتی تھی۔ جب سقط بن مبروک دارودعہ
 اصطبل نے گھوڑے پر آکر خبر دی کہ صلابت جنگ نہ رہے۔ اور جب

وہ مرے ہیں اس وقت صلابت جنگ بھی کہاں تھے وہ صرف نواب صلابت علی خاں تھے۔ بعد میں برکت جنگ کو معلوم ہوا تھا کہ حاکم وقت نے جنگ کے خطاب سے انھیں سرفراز کیا تھا۔

اپنی زندگی میں نواب صلابت علی خاں نے یہ خوش خبری بھی نہ سنی تھی کتنی خواہش تھی کہ وہ بڑے بھائی کی طرح جنگ کے خطاب سے نوازے جائیں اور باپ دادا کا نام روشن کرنے میں ان کا بھی حصہ رہے لیکن محرومیاں ان کا مقدر تھیں۔ ڈاڑھی اور سفید بالوں پر خضاب چڑھا کر واقعی جوان معلوم ہوتے، صحت بھی خاصی تھی۔ خدا بھلا کرے اس حکیم کا جس نے ان کی جان لی۔ چھپے چوری عقدہ ہوا۔ سند سے ابھی اٹھے بھی نہ تھے کہ پیشاب سند ہی پر خطا ہو گیا اور دیکھتے کے دیکھتے وہ وہیں ڈھیر ہو گئے۔ بیٹی کی عمر اٹھارہ سالہ نو جوان لڑکی جس لمحے ان کی بیوی بنی تھی، اسی لمحے بیوہ بھی ہو گئی۔ یہ محرومیاں بھی وہ اپنے ساتھ ہی لے گئے۔ لوگ کہتے ہیں کہ قصور حکیم صاحب کا نہیں بلکہ خود مرحوم کا تھا کہ انھوں نے کشتے کی زیادہ مقدار استعمال کر لی جو ان کے حق میں تریاق کی بجائے سم قاتل ہو گیا۔ نہ ہر بلا اہل ہو گیا۔

برکت جنگ نے اپنے مرحوم بھائی کا پیار بھی اپنی بھتیجی کے لیے مختص کر دیا بلا شرکت غیرے شہزادی بیگم چچا ابا کے اقلیم دل کی فاتح بن بیٹھیں۔ بڑے چاؤ سے اور بڑے لاڈ پیار سے جب اس قابل ہوئیں تو مرحوم برکت جنگ نے اپنے ہی فرزند ارجمند نواب صاحب کے ہاتھ میں شہزادی بیگم کا ہاتھ

تھما دیا، اور یہ سب کچھ بہت دھوم دھڑاکے سے ہوا، بڑے کو دفر سے ہوا۔
 شہزادی بیگم اس طرح نواب صاحب کے پسلی کا جوڑا تھیں۔ آتے کے آتے اس
 بری طرح نواب صاحب پر چھا گئی تھیں کہ انہما کی شکل ہے اب کس طرح کوئی یہ
 بتا دے کہ نواب صاحب چوروں کی طرح ڈیوڑھی میں پھپھتے پھرتے۔ رات کو گیارہ
 بجے سے پہلے ڈیوڑھی میں واپس نہ آجاتے تو پھر رات بھر نہ آسکتے اور اگر آنا
 اتنا ضروری ہوتا تو گیٹ پھلانگ کر آتے، دیوار کو دکر آتے، کسی ملازم کی ہمت
 نہ تھی کہ یہ جانتے ہوئے بھی باہر کھڑا کھڑا آہستہ آہستہ گیٹ پر ٹھپ ٹھپ کرنے والا
 اس ڈیوڑھی کا مالک ہے، اس کا آقا ہے انھیں گیٹ کھول کر اندر بلا لیتا۔ گیٹ
 کی دراندہی سے کوئی سرگوشیاں کرتا۔

سرکار (علی جاگ رہی ہیں پائیں باغ کے پچھلے دروازے کو بھی قفل ڈلوادیا ہے۔
 فانوس ابھی گل نہیں ہوئے خزاوند گیٹ سے آنا، نامناسب ہے، تو کیا
 بچھلی دیوار ہی سے چلا آؤں ۹۔

جی ہاں خزاوند۔ مسقط بن میروک بھی سرکار کے انتظار میں رہیں بیٹھے ہیں
 غلام زادے کو یہاں متعین کر رکھا ہے۔ اور نواب چور راستوں سے مسقط بن میروک
 کے سہارے ڈیوڑھی میں داخل ہو جاتے۔

گھر کا آقا بھی گلی ملی بنا شہزادی کے آگے سہم سہم جاتا۔ پھر دوسرے کس شمار
 میں تھے۔ شہزادی کی ایک آواز نکلتی تو ہر چھوٹے بڑے کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے
 نواب صاحب کے آگے اس کی شکایت کر دیتیں تو اس سے پہلے کہ ان کا شکایتی
 جملہ پورا ہوتا نواب صاحب جرم مانے، معطلی اور برطرفی کے احکام صادر کرنا شروع

کر دیتے۔ شہزادی کی بخشی سے اس آدمی کو فوری ہٹایا جاتا اور کسی دوسرے کو متعین کر کے انھیں باور کر دیا جاتا کہ معطلی کا عمل کر دیا گیا ہے۔

بڑے نواب صاحب کی زندگی تک شہزادی بیگم نے جو چاہا کیا۔ نواب صاحب جب شہزادی سے تنگ آچکے تو انھوں نے بڑے نواب صاحب کے کانوں پر ڈلوایا کہ وہ کہہ سن کر شہزادی کے روئے کو بدلنے میں مدد کریں۔

مدد تو خیر انھوں نے کچھ نہ کی۔ اگلے شہزادی کو معلوم ہوا تو وہ دراتی ہوئی بنگلے پر چھا بابا کے پاس چلی گئیں۔ قدموں سے چمپ کر اس طرح پھوٹ پھوٹ کر روئیں اور بین کر کے نواب صاحب کی بے رنجی کا وہ ردنا رو دیا کہ اگلے نواب صاحب کو اپنا رویہ بدلنے کے لیے نواب صاحب مرحوم نے کافی سے زیادہ نصیحت کی۔ نواب صاحب اس تو تو، میں میں سے تنگ آچکے تو انھوں نے خیریت اسی میں سمجھی کہ رات بڑی ہو تو صبح بھی ڈیوڑھی کے باہر ہی ہو،

یہ دن نواب صاحب کی جوانی کے دن تھے۔۔۔ افروز جہاں پر اس قدر نواز شیں تھیں کہ نواب صاحب دن بھر میں کسی وقت جب تک ان سے نہ مل لیتے سکھ سے نہ رہتے۔ ڈیوڑھی سے اٹھ کر چپ چاپ نکل جاتے۔۔۔ مصاحبین ہی ہی عالم ہا کہتے رہتے۔۔۔ شہزادی کو خبر لھی نہ ہوتی کہ دن کے اجاے میں لھی نواب صاحب اپنی داشتہ کا منہ چاٹ آئے ہیں۔

دوسروں کی نواب صاحب کو فکر نہ تھی لیکن بخت افروز جہاں کو وہ ڈیوڑھی ہی کے کسی حصے میں رکھ لینا چاہتے تھے۔ بہت جبارت کر کے وہ ایک بار مسقط بن مبروک کی مدد سے افروز جہاں کو ڈیوڑھی میں لے آئے۔ بائبریری سے قتل جو حرام

کھا اس میں اپنی افزوز کو چھپا کر کھا۔ ساتھ کھائے، ساتھ پیئے، ساتھ ساتھ بیٹھے
 اٹھتے تھے مشکل سے چار دن گزرے ہوں گے، گیلے بدن پر چادر لپیٹ کر اداسی
 حالت میں اوپر سے برقعہ اوڑھ کر افزوزی اپ پھپ کر تیں ڈیوڑھی سے نکل
 گئیں۔ تو ال میں جسم کو لپیٹ کر نواب صاحب نے جھٹ سے دروازہ کھولا
 تو شہزادی مسلسل دروازہ پیٹ رہی تھیں۔ پٹاخ سے دروازہ کھلتے ہی گرتے
 گرتے نکلیں۔ نواب صاحب نے بو کھلا کر شہزادی کو اپنی آغوش میں لے لیا۔
 کہنے لگے، شہزادی تمہیں کون غیر غلط یاد رکھا ہے، بھلا میں اس حرام میں کسی
 عورت کو لاسکتا ہوں۔ ابا حضور مجھے زندہ بھوڑ میں گئے بھلا۔ اور پھر ڈیوڑھی
 کے سامنے احاطے میں کسی کی مجال ہو سکتی ہے جو تمہاری حکمرانی میں مدد دے۔
 یہ کہتے کہتے نواب صاحب نے غسل خانے کو پھر بند کر لیا، اور جینٹلی چڑھائی۔
 کچھ دیر کے بعد جب شہزادی باہر نکلیں تو وہ کچھ خوش تھیں لیکن اس کے بعد
 افزوزی کو ڈیوڑھی میں لے آنے کی نواب صاحب نے کبھی اجازت نہ کی۔
 ان سے ہمدردی نہ ہو تو پھر کیا ہو گا جس کے بس میں سب کچھ ہو وہ خود
 ہی کچھ نہ دیتے تو اس سے بڑھ کر مجبوری کیا ہو سکتی ہے۔ پھر ایک جان زندگی
 کے کچھ ٹرے بے شمار۔ بخت افزوز جہاں کے اپنے گھر سے اٹھ کر نواب صاحب
 کے حرم میں داخل ہونے تک کسی کو کیا اندازہ ہو سکتا ہے کہ دولت کس طرح پانی
 بن کر بہتی رہی، خیر صاحب دل ہی کا تو معاملہ تھا کوئی مذاق تو تھا نہیں۔ بڑے بڑے
 راجے ہمارے لاکھوں کا خون کر کے ایک رنج زمین کے ٹکڑے کے لیے اپنی جان
 گنوا بیٹھے ہیں تو ان کے نام تاریخ میں محفوظ ہو جاتے ہیں۔ نواب نے کیا

برائی کی۔ یہاں تو بخت افروز جہاں کے اقلیم دل کو فتح کرنا تھا، کوئی اپرخ
 بھر زمین تو کھتی نہیں۔ اور پھر ایک شاعر ہی کی تو جان گئی نا۔ لاکھوں آدمی
 تو نہیں مرے۔ لیکن یہ شاعر کی مخلوق بھی کچھ عجیب و غریب تھی۔ یہ نہیں
 اس کا خون اتنا سرخ کیوں تھا۔ زمانے بھر کی سرخیاں جیسے اسی کے خون کا
 عیون بن گئی تھیں۔ پھیپائے نہ پھیپتے۔ زبان خنبر اور آستین کے لمبوں
 کوئی سا نہ باز ہی نہ ہو پائی جو کوئی چپ رہتا یہاں دونوں ہی مل کر پکارتے،
 اور اتنی قوت سے کہ نواب صاحب سوتے جاگتے یہی آوازیں سننے۔ اور
 جب یہ آوازیں کم ہوئیں تو نواب صاحب کی ہیرے کی آخری انگلی بھی بک
 چکی تھی۔ لیکن یہ بات اس طرح کھلے بندوں کہنے کی نہیں ہے۔ اس لیے کہ
 ان کے متول پہ حرف آتا ہے۔ وہ لاکھ بے حال سہی لیکن ان کے اپنے ذمے
 کے لوگ تو ان کے متول کے سہارے کچھ اور جینا چاہیں گے۔ جو تجوری میں بند
 تھا۔ یہ اور بات ہے کہ تجوری کا متول تجوری میں مقفل رہتا۔ وقت پر
 کام آتا اس کا کام نہ تھا لیکن اس کی افادیت سے بھی تو نہیں انکار کر سکتے
 ۔ اس سے بڑی بات اور کیا ہوگی کہ نواب صاحب کے متول کی گاڑی اسی
 مقفل تجوری کے سہارے چلتی۔

جب سقط بن مبرک نے انتہائی راز میں نواب صاحب سے کہا تھا کہ تجوری
 میں ایک دمڑی بھی اب باقی نہیں ہے تو نواب صاحب کچھ دیر خلاؤں میں
 گھومتے رہے پھر آہستہ سے سقط کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا کہ سقط
 تجوری کے پہرے پر ایک سلج عرب کا اضافہ کر دو۔ دوسرے دن ڈیوڑھی

کے احاطہ میں لوگوں نے ایک دوسرے سے کانوں میں کہا کہ — پہرے
 داندوں میں اضافہ کر دیا گیا ہے — کچھ ہو آخر ہاتھ ہی تو ہے مریگا
 بھی تو گزرتی ہی سے اٹھے گا — اور ہاتھ گزروں سے نہیں انگوں سے
 اٹھتا رہا — بخت افروز جہاں کے اپنے گھر سے نواب صاحب کی
 ماڈیوڈھی میں منتقل ہونے تک پر سچ بچھے تو نواب صاحب کی نوابی صرت
 نام کو رہ گئی تھی۔ لیکن بخت افروز جہاں کو ان کی نوابی سے کچھ سروکار
 بھی تو نہ تھا، اپنا زندگی کا سارا حسن وہ شاعر ہی کے ساتھ دفنائ چکی تھیں
 انھیں اس بات کا بھی بھوٹے منہ علم ہو جاتا کہ ان کی بھوٹی مسمیٰ حسین دنیا کو
 تاراج کرنے میں نواب صاحب کا بھی ہاتھ ہے تو وہ کسی قیمت نواب صاحب
 کو معاف نہ کرتیں۔

غم کے گھٹنے بادل جب چھٹ گئے تو افروزی نے سوچا یہ بادل تو ان کا
 مقدور ہیں۔ زندگی پھر اسی طرح امنڈ امنڈ کر اٹھیں گے اور ٹوٹ ٹوٹ
 کر برسیں گے کیوں کہ نہ کسی چھتار کے پیچھے سر چھپا کر زندگی کے باقی دن
 جوں توں کاٹ لیں۔ سو وہ نواب صاحب کے پاس اٹھ آئیں۔ اور اپنی
 ساری دولت اپنی بہن کو سوپ دی لیکن جلد ہی انھوں نے محسوس کیا کہ جب
 وہ اپنا چھوٹا سا گھر چھوڑ کر نواب صاحب کے پاس آ رہی تھیں تو شاید بچھے
 چوری سارے بادل ان کے چوڑے چٹکے سینے میں گھس آئے اور بڑے
 اطمینان سے وہیں براجمان ہو گئے۔ — باہر کڑی دھوپ پڑتی تھی
 چٹکے، چاندنی نکھرتی لیکن افروز جہاں کے سینے میں جیسے دن رات مسند

برتا رہتا۔ گھٹائیں چھائی رہتیں۔ جیسے زمانے بھر کی برساتیں ان کے سینے میں چھب گئی ہوں۔

نواب صاحب طرح طرح اپنی افروز جہاں کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے۔ ہلکا سا تبسم بھی انھیں بارغ باغ کر دیتا لیکن جیسے وہ افروزی جس سے نواب صاحب کو ٹھکے پر ملتے رہے تھے پتہ نہیں کہاں بجا بھی تھی۔ نواب صاحب اسی افروزی کو اب بھی افروز جہاں میں تلاش کرتے رہتے جو انھیں نہ ملتی۔

بریز آت پیرس، ہمارا فی جھانسی اور لارڈ ڈل سن کی اب کی بار بہت شہرت تھی۔ ان کے کارناموں کے تذکرہ سے تو ساری کی ساری تاریخ بھری پڑی تھی۔ لارڈ ڈل سن پر نواب صاحب بے طرح فریفتہ ہو گئے۔ ۱۹۵۳ء سے آج تک کسی نہ کسی دوران میں کوئی نہ کوئی کارنامہ اس نے ضرور انجام دیا تھا اور پھر ٹرینر سے لے کر لیدر اٹھانے والے تک سب کے سب خاندانی تھے۔ نواب صاحب کو معلوم تھا کہ لارڈ ڈل سن کے خون میں کسی قسم کی آمیزش نہیں ہے۔ بریز آت پیرس ان کا گیس (dog tag) نہیں تھا۔ اعظیم الشان جنگ کے اصرار پر انھوں نے فہرست میں شامل کر لیا تھا۔ اس البتہ ہمارا فی جھانسی نواب صاحب کے دل کا چوسنی ہوئی تھی۔ تیسری دوڑ میں ہمارا فی جھانسی سو فیصد ایکٹیوڈ تھی۔ ہمارا فی کے متعلق یہ شہرت عام تھی کہ مارٹ ڈفرنش آتی ہے۔

نواب صاحب نے سیم بدری و شمال کو تھیلے میں طلب کیا تو پھر ہی دیر بعد خوش و خرم باہر نکلے سیم ڈیریاں اترتے ہوئے بھک کر کورنش بجا لایا۔

پھر سیدھے ہوتے ہوئے کچھ اس طرح ڈکار لی جیسے نواب صاحب بڑی مشکل سے ہضم ہو رہے ہوں۔ لیکن اس سے پہلے کہ سیٹھ بدری دشاں اپنے تانگے میں سوار ہو جاتا نواب صاحب نے کرٹک کر کچھ زیادہ ہی گرجا آواز میں مسقط بن مبروک کو حکم دیا کہ بمبئی کے سفر کی تیاری کرے اور پاس بلا کر کچھ اتنے ہی رازدارانہ انداز میں کہا کہ خود مسقط بن مبروک کے دوستے کان نے کچھ بھی نہ سنا۔۔۔ بظاہر اتنی رازداری کی کوئی وجہ نہ تھی۔۔۔ بخت افروز جہاں کو نواب صاحب اپنے ساتھ بمبئی لیے جا رہے تھے۔ لیکن یہی معمولی سی بات شہزادی بیگم کے کانوں تک پہنچتی تو بات بہت بڑھ سکتی تھی۔ اسی لیے نواب صاحب نے اس انداز سے اظہار کیا کہ خود مسقط بن مبروک کا دوستہ راکان بھی محروم ہی رہا ہو گا۔

نواب صاحب کو بمبئی گئے سمبشکل چار دن گزے ہوں گے کہ مسقط بن مبروک کو ٹیلی گرام موصول ہوا۔۔۔ لو کی ایک ایک بوند نواب صاحب کی رہین منت تھی پھر مسقط بن مبروک عرب تھے۔ عرب بھی ایسے کہ جن کی شر یا نواں میں حیدر آباد کا خون بھی شامل ہو گیا تھا، لیکن مسقط بن مبروک کو اس بات پر فخر تھا۔ جب کہ دوسرے عرب اس بات کو اہانت آمیز سمجھتے تھے۔ ٹیلی گرام ملا تو وہ بے چین ہو گئے۔

بدری دشاں نے اب کی بار صاف انکار کر دیا۔۔۔ وہ تو برسوں کی یاری آج کام آگئی ورنہ کیا ہوتا۔ صیقل خان رہیلہ نے مسقط بن مبروک کی پیٹھ ٹھونکی اور چپکے سے سوسو کے باج کرٹک ٹوٹ اس کے ہاتھ میں تھا دیا۔۔۔ مسقط بن مبروک کو ادھر لوگوں نے صیقل خان سے بغل گیر ہوتا ہوا دیکھا۔ ادھر دوسرے ہی لمحے وہ پوٹل آؤر کی کمیل کر دے بعض لوگوں کو پوسٹ آفس میں نظر آئے۔۔۔ بھی ننگ کا

پاس ہو تو اس طرح ہو کہ رقم نواب صاحب کے پاس بھجوا چکے تو کس قدر باغ باغ
 کھتے مسقط بن مبروک۔۔۔ جاتے سے باہر ہو رہے تھے پھولے نہ ساتے تھے۔
 راستے میں شہر ان پوٹل کے ”باہر والے“ نے بھک کر سلام کیا تو رکشا میں بیٹھ
 بیٹھے ہی انھوں نے آواز دی کہ چوکیں نا جلدی سے بڑھ کر ”دو پونے میں ایک کھڑا
 چمچہ“۔۔۔ چائے آگئی تو ”کھڑا چمچہ“ مسقط بن مبروک نے خود سنبھالا اور دوسری
 پیالی کی طرف اشارہ کر کے چوتھے کہا: ”پی لو، عیش کر دو“

ادھر چوڑے عیش کیا، ادھر نواب صاحب نے بمبئی سے لوٹے ہیں تو
 سگا رک ڈب تک خالی تھا۔ ہاں بخت افروز جہاں کے سرخ ہونٹوں پر تبسم بھی تھا
 اور ٹھکے ہوئے بدن پر نیکی اور مادرن ساری تھی۔

جب مسقط بن مبروک نے شہزادی سے دست بستہ عرض کیا کہ ”سن براند
 امر تیری پادشہ کیٹ، اب باز اور بھر میں نہیں مل رہے ہیں تو بھلا وہ کس طرح
 سمجھ سکتی تھیں کہ حکومت نے جاگیریں ضبط کرنے کی کارروائی مکمل کر لی تھی اور یکم
 بازار کے سب سے بڑے بنیے نے غلہ حسب معمول قرض دینے سے انکار کر دیا تھا۔
 جادل کی بوریاں گودام میں رکھواتے ہوئے مسقط بن مبروک حسب عادت
 مسکرانے کی کوشش کر رہے تھے اور فتوہ دار چن سے چھپر چھاڑ بھی جاری تھی، لیکن بغور
 دیکھنے سے کسی بھی صاحب نظر کو اس امر کا اندازہ ہو سکتا تھا کہ ان کی مسکراہٹیں
 ان کی تنگ کو جھٹلا رہی ہیں۔ ان کی چہل ان کی اداسیوں کی غمازی کر رہی ہے
 جو درد نواب صاحب کے دل میں جاگزیں ہو گیا تھا۔ وہی کرب مسقط بن مبروک
 کے حصے میں آتا بھی اسی طرح ضروری تھا کہ نواب صاحب کی خوشی میں ان کی خوشی

جھوٹ موٹ اعلان کر رہی ہے جاگیرداروں کے نام سے۔ لیکن مسقط بن برفک کو اڑنی چڑیوں کے پر گنتے کافی بھی آتا تھا۔ جب بنی نے انکار کیا کہ اس ماہ امرتسری چادل کے پکیٹ تو رہے ایک طرف، کوئی ٹھیک سا باریک چادل بھی اس گودام میں نہیں ہے تو وہ فوری سمجھ گئے کہ دراصل وہ ان سے پوچھ رہا ہے کہ جو کچھ اب تک تم اور تمھارے نواب صاحب کھاپ چکے تھے، اس کی ادائیگی کے لیے سیز دیپٹے اور ڈھی ہوئی وہ ایبلی زمینیں کہاں سے آئیں گی جن کو تم جاگیر کہتے تھے۔ اور اس کے بعد یہ سوال بہت ساروں نے دہرایا جن میں سیدھ بدری و شال بھی شامل تھے۔ جان کلفٹن بھی اور صیفیل خاں مردہلہ بھی۔

پچھلی رات تک جس دیوان خانے میں فانوس جلتی تھی آج اس کی چھت پر لمبی لمبی سچیں اس طرح لٹک رہی تھیں جیسے پھولوں سے بھرے ہوئے پودوں کو نوچ کر نکا کر دیا گیا ہو مسقط بن مہر وک کی طلبی ہوئی تو وہ ددڑ گئے کہ شہزادی آج چل قدرتی کے لیے نکلی تھیں۔ دیوان خانے سے ہو کر گزری ہیں۔ جو دیکھا ہے وہ بچھیں گی ہی۔ اور جواب ان کے ذہن میں محفوظ تھا۔ آداب بجا لا کر انھوں نے ابھی گر دن بھی نہیں اٹھائی تھی کہ شہزادی نے بوچھا۔ مسقط ابھی تہینہ بھر بھی تو نہیں ہوا کہ سارے فانوس تیزاب سے دھلو کر صاف کر دائے گئے تھے۔ پھر کیوں صفائی کی ضرورت پیش آئی۔ مسقط نے کہا کہ کسی نے حضور کو غیر غلط یاد رکرایا ہے پھر صفائی ہو رہی ہے۔

تو کیا ہوا میں تھیں ہو گئے ہیں یا غنقا ہو گئے ہیں؟

مسقط بن مہر وک سمجھ گئے کہ نیم صاحبہ آہستہ آہستہ غصے میں آ رہی ہیں۔ ان کے

غصے کے ڈھنگ بھی نرا تھے، غصے کے عالم میں بھی آدمی کو دیکھ کر اس کی ہستی کے مطابق الفاظ استعمال کرتیں۔ گھر کی باورچی یا کاماٹن پر برہم ہوتیں تو بے حجابا گالیاں بکے جاتیں۔ مسقط بن مبروک پر غصہ کرتیں تو اتنا ضرور ہوتا کہ مفاظ سے اس کو نہ نواہتیں لیکن گھٹی کا دودھ یا دولا تیں ضرور۔ اب بیگم صاحبہ نے لفظ عقاب استعمال کیا تو مسقط بن مبروک سمجھ گئے کہ انھوں نے اپنی دانست میں موٹی گالی دی ہے۔

تھٹ سے عرض کیا کہ حضور شاہ جمال صاحب جو روح القدس کی درگاہ کے بڑے سجادے ہیں سارے کے سارے فافوس پر دانگی پراٹھائے گئے ہیں۔
 ”کیوں بھلا؟“

”درگاہ کا عرس ہے نا خداوند۔“

”عرس تو ہر سال ہوتا ہوگا۔“

”اب کی بہت دھوم دھام سے کر رہے ہیں حضور۔“

”ہمیں اطلاع دیے بغیر اجازت دی کس نے؟“

”سرکار جلدی میں تھے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ شہزادی کے گوش گزار کر دوں۔“

”لیکن تم خود اس گھر کے مالک بن بیٹھے ہو۔ تم نے مجھے اس قابل نہیں

سمجھا ہوگا کہ مجھ سے اجازت لیتے۔ ذرا آنے تو دو تمھارے سرکار کو۔“

”خداوند، خداوند۔“

لیکن شہزادی نے ایک نہ سنا۔

مسقط بن مبروک بار بار اپنی صندوقی کے جیب کو اپنے ہاتھ سے جھوڑ چکے

سے دیکھ لیتے تھے جیسے جیب میں سوچن سے رکھے ہوئے نوٹ ساری سازشوں کا
بھانڈا چھوڑ دیں گے جو ابھی ابھی آکشن ہال کا مینجر فانوس کی قیمت کی صورت میں
ادا کر گیا تھا۔

شہزادی بیگم آخر تک سہرہ بیٹیتیں۔۔۔ غصہ ہوا نفرت ہو یا محبت ہر حال
کے ساتھ ہر جذبے میں ٹھہراؤ آنا ضروری تھا۔۔۔ وہ آواز جو ڈیوڑھی بھر کے دل
دہلا دیتی تھی، اور جو ذواب صاحب کے چوڑے چکلے سینے میں بھی اٹھل پھٹل مچا دیتی
تھیں اب خود اپنے ہی تیروں سے محروم ہو کر جیسے ڈیوڑھی کے ہر کونے میں بے آسرا
بھٹکتی رہتی۔۔۔ یا سمن بوا، رپ بھپ کر تیں، ڈیوڑھی بھر میں گشت لگاتی پھرتیں
۔۔۔ پچھے چوری پھر دک بن مسقط کے ہاتھوں جو تیریلیاں آئے دن ڈیوڑھی میں پور
تھیں ان پر نظر رکھتیں اور کھنڈی سانئیں بھر کر شہزادی بیگم تک ساری باتیں پہنچا
دیتیں۔

نوج غسل خانے کے سنگ مرمر بھی اکھڑ چکے ہیں شہزادی۔

نوج لمبریری کے بک شلف اور کتابیں مسقط بن مبروک لاری میں ڈال کر لے گیا
ہے کہیں۔

شہزادی محسوس کرتیں کہ ڈیوڑھی میں بھائیں بھائیں کرتے اندھیرے چاروں طرف
کسے کسے رہے ہیں۔ یا سمن بوا نہ ہوتیں تو یہ اندھیرے اس قدر تیری سے ڈیوڑھی
بھر پر قبضہ کر لیتے کہ ہاتھ کو ہاتھ سمجھانی دینا مشکل ہو جاتا۔۔۔ یا سمن بوا کا دم
تھا کہ وہ ہر اندھیرے کے قافلے کے دبے پاؤں آمد کا پتہ تو دیتی تھیں۔۔۔ ان کے
توسط سے شہزادی کے کافر تک یہ بات پہنچ چکی تھی کہ ان ساری تباہیوں کے ذمہ دار

نواب صاحب نہیں بلکہ نئی حکومت ہے۔ جو دھاندلی مچا کر جاگیریں ضبط کر چکی ہے۔
 رہ گیا اسیں، جو اداۓ شراب کا خرچ سودہ اتنا کہاں ہوتا ہے جو گھر کی چیزیں بازا میں
 نیلام ہوں۔ جن ہاتھوں میں پہونچتے پہونچتے ہزاروں کے نوٹ پانی بن کر بہہ
 جاتے تھے وہ ہاتھ ابیسی مٹھی بن کر لیں تو کبھی بہتی مایا منجھو ہو کر رہ بھٹوڑی جائے گی۔
 لیکن یا سمن بو اچھ اس انداز سے نواب صاحب کی ہمدردی کرتیں جیسے شہزادی
 کو جھنجھوڑ رہی ہوں کہ نواب صاحب کی ڈھیلی ڈوری کو ذرا کھینچنا نہ جائے تو خود
 زور لگا کر ساری ڈیوڑھی کو بازار میں کھینچ لیں گے اور شہزادی بیگم خود ان سے یا سمن
 بوا کی ہمدردی کے دہ پردہ جذبے کو روز روشن کی طرح پکیں جھپکا جھپکا کر دیکھ لیتیں
 ۔۔۔ لیکن بات احساس کی حدوں سے دور جا چکی تھی۔ شہزادی بیگم خود بھی تو
 وقت کی بنھن پر ہاتھ رکھنے کا اندازہ جانتی تھیں۔ انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ سادی
 ڈیوڑھی کو بازار میں جانے سے بچانے کے لیے اس ڈوری کو کھینچنے کی ضرورت ہو
 جس کا ایک سر نواب صاحب کے ہاتھ میں تھا لیکن دوسرا سر شہزادی کے ہاتھ
 سے نکل چکا تھا۔ اب تو ان گھپ اندھیروں میں ڈوری کے اس سرے کو تلاش
 کرنے تک پتہ نہیں زندگی کہاں سے کہاں تک پہونچ جائے۔

ڈیوڑھی کا پھاٹک بند ہو جانے پر دبے پاؤں دیوار پھلانگ کر خود اپنے گھر
 میں چوروں کی طرح داخل ہونے والا اب چار چار دن ڈیوڑھی کا رخ بھی نہ کرتا
 تھا۔ شہزادی بیگم خود اپنی ہی آگ میں کچھ اس طرح جل رہی تھیں جیسے جل نہیں رہی
 ہوں بلکہ سر جھکائے بیٹھی آگ تاپ رہی ہوں۔ ان کی اپنی آبائی جاگیر کا حصہ بھی قابل
 کاغذ تک کم ہو چکا تھا۔ حکومت نے جس قدر حصہ نواب صاحب کو مقرر کیا

بھٹے مار مار کر کھینچتی رہیں کہ ایک بار ان کے ہاتھ سے پھوٹا ہوا سر اچھران کے ہاتھ نہ لگا۔ اب دکھانے والا چار چار دن گھر کا رخ ہی نہ کرے تو شہزادی بیگم....
 ”میں کبھی ذرا دیکھوں“ ”میں بھی تو را دیکھوں“ لگی رٹ لگائے رہیں تو بھی کیا حاصل
 — نواب صاحب بھی کیا کریں گے بے چارے۔ جاگہیں تھیں، منول تھا، عزت تھی، غرض ہر قسم کی تن آسانیاں تھیں تو شہزادی بیگم کے ناز اٹھاتے تھے، غرض سیتے تھے، برہم ہو جاتیں تو سو سو طرح مارتے تھے۔ اب آدمی زیادہ اہم کاموں میں گتھ جاتے، تفکرات جو ہر طرف سے آگھیریں تو ان ناز برداریوں کے لیے وقت ہی کہاں رہ جاتا ہے۔ وقت بے بھی تو دل کے اندر طنائیں لگاتے والی اداسیوں کے خمیوں کو آگھیر پھینکنا بھی تو کچھ اتنا آسان نہیں ہے نا۔ اور جب نواب صاحب کئی دن بعد ڈیوڑھی پہنچے تو شہزادی بیگم دیکھنا دکھانا سب بھول گئیں۔ سب سے اہم مسئلہ جو درپیش تھا۔ اور پھر المیہاں نے رحم جو ڈال دیا تھا۔ اپنی نرمی کو چھپا کر بولیں۔

تم پردہ لگی رکشا میں چھپ چھپ کر راتوں کو کس وکیل کے پاس جاتے تھے۔ مجھے سب پتہ چل چکا ہے۔ عدالت سے نوٹس لا کر کھڑے کھڑے مالک مکان نے اس غریب کو گھر سے نکال دیا۔ برقعہ اوڑھ کر سیدھی ڈیوڑھی میں چلی آئی اور میرے پیر پکڑ لیے، کہنے لگی میں آپ کے پیر کی خاک سہی پر لوگ نواب صاحب کو میری جی مانگ کا سینہ در سمجھتے ہیں۔ در بدر کھوکھیں کھاؤں گی تو لوگ مجھ پر نہیں نواب صاحب پر انگلیاں اٹھائیں گے۔ جی میں آئی کہ جھوٹے پنچو کہ تمہاری آبرو کا نیلام بیچ کر لوں پر کہ دادوں لیکن اللہ رسول کے خوف سے سہم گئی اور پھر یہ بھی سوچا کہ کبھی سہی

مگر اپنی حقیقت اور حیثیت کو پہچانتی ہے۔ کہنے لگی: میں آپ کے پیر پھونے کے لالین بھی نہیں ہوں۔ میری ماں آپ کے محترم والد کے حضور میں مجرا دیتی تھیں۔“
 نواب صاحب نے دکھلا کر کہا کہ ہاں یہ تم وہ جانتی ہے کہ تم کس باپ کی بیٹی ہو۔
 شہزادی مسکرائیں اور کہنے لگیں۔ لوجی اس قدر کجاہت سے کہہ رہے ہو جیسے تم مجھ سے کچھ کم ہو۔

نواب صاحب کچھ کہنے ہی والے تھے کہ شہزادی نے جیسے چونک کر کہا۔
 ”ہاں میں بھول ہی گئی تھی۔ تین ماہ سے لائٹ کا بل ادا نہ کرنے پر لائٹ کاٹ دی گئی ہے۔“ اور نواب صاحب نے مسقط بن مبرک کو رات کے اجالے کے انتظام کے لیے پکارا۔ مسقط بن مبرک بلائے گئے تھے ڈیوڑھی کے اندھیرے دور کرنے، لیکن وہ آئے تو ڈیوڑھی کے اندھیرے جیسے ڈیوڑھی سے بھاگ کر نواب صاحب کے سینے میں جا پھپھے۔

نواب صاحب کے ذہن سے پتہ نہیں کیسے جو ہو گیا کہ کل مقدسے کی سماعت ہونے دینے جان کھٹن نے یک طرفہ ڈگری حاصل کر کے نواب صاحب کا موٹر تک نہ چھوڑا تھا۔

قدرت علی شوفر کے گھر تین وقت کھانے کے علاوہ کہاں دس بار چائے بنتی اب صرف ایک بار چولھا جلنے لگا۔ خیر پھوٹا آدمی تھا۔ ایک بار کھالے بھی تو غنیمت ہے۔ جہاں بے شمار لوگ فاتے کرتے ہوں، وہاں ایک وقت کا کھانا بھی تو نعمت ہے۔ لیکن حالت تو نواب صاحب کی دیکھی نہ جاتی تھی۔ مقدموں کی پیروی تو خیر ان کی جوتی کرتی۔ وہ ابھی اتنے گرسے بھی نہ تھے جو ہر دفتر کی بیڑھیا

چڑھتے پھرتے، لیکن بقول نواب صاحب کے، اس فرنگی نثراد، کیسے درازی کے بچے جان کلفٹن نے ایک بار تو انھیں عدالت کھینچوایا ہی۔۔۔ حج کوئی ان کا پرانا ساتھی ہوتا تو نواب صاحب جان کلفٹن کو گھپی کا دودھ یا دودلا دیتے۔ سر باز اور سر منڈھوا کر اس عمر میں اس کے عقیقے کی تقریب مناتے۔ لیکن، نیا ہی بدل چکی تھی۔۔۔ نہ مصطف اپنا، نہ انصاف اپنے بس میں۔۔۔ خیر یہ تو جو کچھ ہوتا، ہوتا ہی۔۔۔ پہلا سوال تو یہ تھا کہ استنہ باعزت خاندان کا فرد، نواب ابن نواب جس کی رکھی ہوئی عورتوں کے پڑے پھڑے لونڈے بھی موٹروں میں پھرتے۔ اب وہ خود بھلا کس طرح چل کر عدالت تک جائے گا۔ نواب صاحب بہت ادا اس تھے۔۔۔ رات بھر کروٹیں بدلتے رہے۔ جیسے ہر تار پر بستر خاہ بستر بن گیا ہو۔

صبح ہوتے ہوتے مسقط بن مبروک کے ذہن رسائے پھر یاوری کی۔ رسائے کی طرح چمٹے رہنے والے احباب، آفتاب سر پر آگیا تھا، تو غائب ہو گئے تھے۔ صحن ایک مکی میاں رہ گئے تھے جو آج بھی دوستی کا دم بھرتے تھے۔ لیکن مسقط بن مبروک نے دنیا کا رنگ ڈھنگ بھنگی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ زمانے کی ایک ایک کردٹ کو دکھے دل سے محسوس کیا تھا۔ انھیں نہ دوست کی دوستی پر اعتماد تھا، نہ خون کی سرخنی پر۔ سو اسی لیے ان کو اس دقت مکی میاں کی غیر متوقع آمد بھلی نہ لگی۔ ذرا کی ذرا نواب صاحب کو تخیلے میں بلا کر انھوں نے کان میں کچھ کہا۔ اس کے بعد مکی میاں نے دیکھا کہ مسقط بن مبروک کو نواب صاحب نے چمٹ کر گلے سے لگایا۔

عدالت کا وقت ہوتے ہوتے لوگوں نے دیکھا کہ نواب صاحب کی سواری بہت

دن بعد نکلی ہے، لیکن سوائے اس کے کہ کوئی نئی بات نہ تھی کہ موٹر بدلا بدلا ہوا تھا، شو فر بدلا ہوا تھا، اور یہ دونوں بھی نواب صاحب کے متول کی نشانی تھے، جو بد ہی رہتے تھے۔

نواب صاحب عدالت میں پہونچے تو جان کلفٹن پوچھو ہی میں پارکنگ کرنے کی فکر میں تھا۔ نواب صاحب کا موٹر پہونچا تو اس نے اپنی غلطی محسوس کی۔ اور جب دونوں اپنے اپنے موٹروں سے اترے تو جان کلفٹن نے تقریباً دہرا ہوا کہ نواب صاحب صاف صاف مٹا کر دیا۔ اور عدالت کی سیڑھیاں چڑھنے تک نہیں ہنس کر اور نواب صاحب کو سو سو طرح رچھا کر ان سے معافی مانگتا رہا۔ لیکن وہ ہی منٹ بعد وہ واپس لوٹ آیا اور سیدھے نواب صاحب کے موٹر کے پاس پہونچ کر لگا ڈرائیور سے مسلسل سوالات کرنے۔

ڈرائیور نے نواب صاحب کے دوست کی حیثیت سے ابھی ابھی جان کلفٹن کو دکھا تھا۔ وہ موٹر کے قریب آیا تو عظماء ڈرائیور نیچے اتر کر کھڑا ہو گیا۔

کلفٹن نے اپنی ٹوٹی پھوٹی اردو میں پوچھا۔ ”نواب صاحب ادھر آیا؟“

ڈرائیور نے جواب دیا۔ ”نہیں صاحب“

”مٹ کار کو پر اپری ڈسٹ نہیں کیا؟“

ڈرائیور کچھ نہ سمجھا۔

جان کلفٹن نے مٹ کار پر اپری ڈسٹ سے۔

صلیب کا نشان بناتے ہوئے کہا۔

”ڈسٹ ہے نا“ اور پھونک مار اپنی انگلی کی پور پر جی ہوئی گر دجھاڑ دی۔

ڈریس یور سمجھ گیا۔

”جلدی میں صاف نہ کر سکا صاحب۔“

”دل نیو کا رہا؟“

”ٹیکسی صاب“

”ٹیکسی!؟“ — جان کلفٹن نے تعجب سے دہرایا۔ — ”فریگی کا نمبر

نہیں لگایا۔“

”آج کل بڑا نواب لوگ اور جاگیر دار پرویٹ نمبر کا موٹر چاہتا ہے

صاب۔ اس لیے ہمارا سٹھ پرویٹ نمبر پر ہی چلتا ہے۔“

”ایسا کیوں مانگتا نواب لوگ؟“

”ٹیکسی میں بیٹھنا بری بات سمجھتا ہے صاب؟“

”تم ٹیکسی ڈریس؟“

”ہاں صاب۔“

”فریہ ڈریس؟ (DRESS)“

”نواب صاب کے پرانے شو فر کا ہے صاب۔“ — نواب صاب یہ ڈریس

پہننے کا دو روپے علاحدہ انعام دیتا ہے۔“

”ونڈرفل، ونڈرفل“

اور جان کلفٹن نے فلک شرکان قفقہ لگایا تو ڈریس سمجھ نہ سکا کہ وہ نواب

صاب کا مذاق اڑا رہا ہے یا خود اس کا اپنا۔

وہ جانے لگا تو ڈریس نے دل ہی دل میں اس کو گالی دی۔ — لیکن

دیر گئے نواب صاحب واپس ہونے لگے تو وہ موٹر میں سوار ہوتے تک ان کے ساتھ
 تھا۔ سوار ہونے سے قبل اس نے خود بڑھ کر کار کا پٹ کھولا، اور بہت بجٹ
 سے مصافحہ کر کے مسکراتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

موٹر ارٹارٹ ہوا تو اس نے مسکرا کر نواب صاحب اس کے متعلق پوچھا۔
 نواب صاحب کے چہرے پر چمک پیدا ہوئی۔ انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا
 ایک ہمینہ ہوتا ہے اس کو خرید کر مسٹر کلفٹن۔ پرانی کار آپے جو ہتیا لی تھی۔
 یہ آپ کو پسند ہے نا۔

اس سے پہلے کہ مسٹر کلفٹن موٹر کی تعریف کرتا۔ ڈرائیور نے اسکو گھور کر
 دیکھا اور کار بڑھا دی۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی شعاعیں موٹر کے شیشے سے
 چھن کر نواب صاحب کے چہرے کو اجال رہی تھیں اور وہ نمکنت سے سگاہ
 جلا رہے تھے۔

کتاب سے کہتے ہیں

منوریاں خاندان بھرمیں لائق فائق مشہور تھیں۔ عربی، فارسی، انگریزی، ہندی،
 زبانیں جانتے تھے اور جانا بھی کیا۔ عالموں فاضلوں کے کان کاٹتے تھے بحث و
 تخیص ہوتی، مکالمے و مجادلے ہوتے تو منوریاں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے بس مجبور
 تھی سوائی ہی کہ خیالات کی وسعتوں کا زبان ساتھ نہ دے پاتی۔ رک رک کر کلمہ کلم
 کر، چبا چبا کر کچھ اس طرح بحث کرتے کہ موضوع کتنا ہی جان دار ہو منوریاں کی
 زبان پر آکے دم توڑتا ہو اس محسوس ہوتا۔

خیر یہ تو ان کی اپنی کمزوری تھی لیکن اس سے ان کی قابلیت اور فعالیت پر
 بھلا کیا اثر پڑ سکتا تھا وہ بلاشبہ علوم شرقیہ کے فاضل اور مغربی علوم کے ماہر سمجھے جاتے
 تھے۔ بڑھتے رہتے ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ ان کی بیوی ان کے اس شغل سے کچھ
 بیزار سی تھیں مگر آخر دنیا میں اور بھی تو کچھ کام تھے۔ لیکن منوریاں کو کسی کام سے

کوئی واسطہ نہ تھا۔ وہ تھے اور ان کی کتابیں تھیں۔ ان کتابوں اور عینک کے بیچ میں واسطے اور رابطے کا فرض انجام دینے کے لیے اگر کچھ اور تھا بھی تو وہ پکے پاؤں کی خوبصورت اور ننھی منی سی گھوڑیاں تھیں اور ان گھوڑیوں کے لیے انھیں اپنی بیوی کی گوری انگلیوں کا رہین منت ہونا پڑتا تھا جو کتھے اور چونے میں کچھ اس طرح رنگ گئی تھیں کہ اب یہی رنگ ان کا اپنا اصلی رنگ ہو گیا تھا۔

مغہ میں پان کی گھلاوٹ کا احساس مٹتے ہی ان کا ہاتھ کرسی کے برابر دھری ہوئی نیپائی تک جاتا۔ کھلے ہوئے خاص دن میں سے ان کی انگلیوں کی پوروں میں ایک ننھی منی سی گھوڑی دبی ہوئی سہمی ہوئی ان کے جبروں تک جا پہنچتی۔ پھر آنکھوں کی چمک عینک کے شیشوں سے گزر کر کتاب کے صفحوں کو منور کر دیتی۔ پھر جیسے ان کے دل و دماغ منور ہو جاتے، ذہن روشن ہو جاتا۔

منوڑیاں کی کتابیں ان کی بیوی کے لیے سوتلے پائے کا طعنہ تھیں مگر کیا کرتیں یہ چاری وہ بڑے غصیلے، بڑے بارعب اور لمبے دیے آدمی مشہور تھے۔ جس بات کو وہ اصول پسند سمجھتے تھے اس کو ان کی سقی قلبی کہنے سے بھی لوگ نہ چوکتے لیکن یہ سب کچھ ان کے پیچھے ہوتا۔ وہ بھی ان باتوں کی پروا نہ کرتے تھے۔ راجہ بھون جیسے بیٹھے تھے اور خاندان کا ہر فرد انھیں گنگوٹیلی ہی نظر آتا۔

چوڑی ہڈی اور دوہرے بدن کے مضبوط سے آدمی تھے۔ ناک نقشہ سجیلا ہی تھا لیکن رنگ کم از کم بیوی کے ساتھ ہوتے تو رنگ کا فرق اور نمایاں ہو جاتا تھا۔ مگر دواڑھی اور اس پر ٹخنوں تک چڑھا ہوا شرعی پاجامہ۔ اس کے باوجود بھی دیکھتے ہیں آنکھوں کو بڑے نہ لگتے تھے۔ البتہ جی یہ ضرور چاہتا کہ یہ سب کچھ نہ ہوتا

تو مناسب تھا اور اگر ہے کبھی تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اب کس کو پڑی تھی کہ ان کے حیلے میں ان کی ہدایت میں اتنی دل چسپی لیتا۔

لیکن سنتے ہیں کہ ان کا یہ انداز مرشدانہ ان کے سانس سسر کو ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ پرجہ پوچھیے تو بیوی بھی دل ہی دل میں ان کے اس رہن سہن سے اٹلاؤ گئیں لیکن کچھ تو مذہب و شرع نے زبان پر تائے ڈال رکھے تھے کچھ شرم و حیا نے لب سے دیے تھے اور سب سے بڑھ کر منور میاں کی اصول پیزی نے اس جذبہ ہی کو ان کی بیوی کے دل میں دفن رکھا تھا کہ کبھی وہ ترنگ میں آکر ان کے سینے سے لگی ہوئی گھنٹیں نہ تھکتیں۔ — اچی اس داڑھی واڑھی کے جگر سے باہر نکل آؤ نا۔

الشر رکھے منور میاں کے سات بچے تھے۔ آٹھویں کی آمد آگئی۔ وہ ہر بچے کو الشر کی برکت پر محمول کرتے اور اس کو خوش آمدید کہنے کے لیے تیار رہتے۔ ایک برکت نازل ہو کر کچھ ہی عرصے گزرے کہ دوسری برکت کے نزول کے لیے الشر میاں کو ہموار کر لیتے۔ رہ گئی بیوی سودہ تو ایک ذریعہ عقلیں۔ پھر محکوم و مجبور الگ۔ منور میاں نیم خدا تھے۔ ان کا التفات ہی تو ان کی بیوی کے لیے سب کچھ تھا۔ جب چاہا کر لیا ہے کبھی قفس بہاراں — کے مصداق۔ جب چاہتے کچی نیند سے بیدار کر لیتے۔ اور اس طرح برکت کا نزول ہوتا رہتا۔

پھر یہ برکتیں بخوں غاں کی منزلوں سے گزرتیں تو صحن میں پہنچتیں۔ صحن سے احاطے کے وسیع میدان تک جاتیں۔ میدان سے قبروں کے چوتروں پر آتیں پھر قبروں پر چڑھ کر منہ سے عجیب عجیب آوازیں نکالتیں اور انھیں گھوڑا بنا کر ان پر سواری کرتیں۔

منورمیاں اپنی سسرالی ہی میں رہتے تھے۔ خسر صاحب کے جہاد مجاہدین کوئی حسب
 بڑے پائے کے بزرگ گزرتے تھے۔ صاحب کمال، صاحب فن، صاحب علم و دانش
 منورمیاں کے خسر کو اس درگاہ کی دیکھ بھال اور تعمیر و ترمیم کے لیے ”دفتر امور مذہبی“
 سے سالیانہ مقرر تھا۔ وہ اس درگاہ کے سجادہ نشین بھی تھے، ستولی بھی۔ جو کچھ سالیانہ
 مقرر تھا وہ بھینٹا دیا کرتا تھا کہ ٹوٹی ہوئی قبریں بنائی جاسکتی تھیں۔ احاطے کا گرا بڑا
 درست کیا جاسکتا تھا۔ معمولی نہیں اوسط پیمانے پر سالانہ عرس منایا جاسکتا تھا۔
 چراغاں کیے جاسکتے تھے اور منورمیاں کے خسر یہ سب کچھ بڑی لگن سے کرتے، بڑی
 فراخ دلی اور ایمان داری سے اپنے فرائض سے عمدہ بہ آہوتے۔ اس کے باوجود
 بھی اتنا بچ رہتا کہ اچھا کھاتے، اچھا پہنتے اور ڈھتے اور منورمیاں کے کفیل ہوتے۔
 منورمیاں بے چارے علم کی پیاس بجھانے چلے تو یہ سمندر تھیں اتنا وسیع نظر آیا
 کہ اس بحر بیکراں سے صدف و گوہر کی تلاش نہ تھیں نہیں کا نہ رکھا۔ بیوی سے واسطہ
 نہ بچوں سے تعلقی خاطر۔ برکتوں کا نہ ول ہونا اور یہ برکتیں ساس، سسر کو سو نہی
 جاتیں۔ پھر قبروں کے سینوں پر چڑھ کر مونگ دلتیں۔ بیوی بے چاری شین کی طرح
 خام مال منورمیاں سے ملتی۔ اور غوغاں کرتا، ہمکتا، مسکراتا بچہ ان کے لیے
 حاضر کر دیتیں پھر منورمیاں بے چارے علم کے سمندر میں ایک ماہر غواٹ کی طرح
 غوطہ لگا آتے۔ لیکن ان کی تشنگی بڑھتی ہی جاتی۔

آدمی شد بد بڑھ لے، انہا کہ کچھ کر کے اپنا اور اپنی بیوی بچوں کا پیٹ پال لے
 تو آدمی آدمی ہی رہے گا۔ نہ بڑا آدمی بن سکے گا، نہ مرد مومن، خاندان کا ہر فرد
 یہی سب کچھ کرتا تھا۔ لیکن منورمیاں نے کچھ اور ہی ٹھان رکھا تھا۔ انھیں علم کے بحر بیکراں

کو اپنے دماغ کے کوزے میں بند کرنا تھا انھیں وہ سب کچھ بننا تھا جو ان کے خاندان میں
 آج تک کوئی نہ بن سکا تھا۔ سو انھوں نے اپنے لیے سمندر وں اور طوفانوں کو چنا بھلا
 بیوی اور بچوں کو وہ ساتھ لے چلتے تو ڈوب نہ مرتے بے چارے۔ انھوں نے دانشمندی
 سے کام لیا اور ساس سسر کو اپنی بیوی بچوں کے ساتھ اپنی ذمہ داریاں بھی سونپ دیں۔
 ۴۔ اب وہ تھے اور علم کا طوفان تھا۔ اب وہ تھے اور علم کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا۔
 منشی عالم، منشی فاضل اور ادیب کامل تو تھے ہی انگریزی کا چمکا پڑا تو ایک
 پرچہ دے کر گریجویٹ ہو بیٹھے۔ پھر اس کے بعد انھوں نے کبھی ارسطو کو ارسطو نہیں کہا
 ارسطو اٹلی ہو گیا وہ۔ اور جس دن ارسطو، ارٹائل بنا ہے، اس دن سے انھیں
 خود اپنی داڑھی کھٹنے لگی۔ شرعی پا جامہ کھسک کر ٹخنوں تک آپہنچا۔
 ایک دن چپکے سے اٹھے، نماز فجر ادا کی اور پڑ دس کے حجام کے گھر پہنچ کر
 کٹڑی کھٹ کھٹادی۔ عزیز باہر نکلا تو فوری پہچان گیا کہ منور میاں ہیں۔ جھک
 کر ادب بجالایا۔ منور میاں بوکھلائے سے بس اس کا منہ تکتے رہے اور اپنی داڑھی
 کھجاتے رہے۔ اس نے بہت لجاجت اور عجز و انکساری سے اتنی صبح تشریف
 لانے کی وجہ پوچھی۔ منور میاں بے چارے مشکل کہہ سکے کہ ان کی داڑھی میں جوئیں پڑ گئی
 ہیں جوئیں پڑ جائیں یا چھپکیاں اور گر گٹ جا گھسیں، حجام بے چارہ بھلا اپنے منہ سے
 تو کہہ نہیں سکتا تھا کہ سر کا تشریف انھیں پلک جھپکنے میں داڑھی مونڈ کہہ سارے کے
 سارے بال ”دامن مراد“ میں بھر دوں گا۔ وہ بے چارہ حکم کا منتظر بس انھیں دیکھتا
 رہا۔ منور میاں پر شرم غالب تھی لیکن ارٹائل نے پھر شہ دی۔ مہٹ کر کے اٹھ بیٹھ
 کہہ دیا کہ بھئی مونڈ ہی جو۔ یہ جوئیں بہت —

حجام کے کان میں جیسے کن کھجور جاگھسا۔ اسے یقین نہ آیا۔ اس نے آنکھیں مل کر پھر بغور منوریاں کو دیکھا جو نظر نیچی کے ارٹاٹل سے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ جب حجام اپنی ہنرمندی اور چابک دستی کا مظاہرہ کر چکا تو واقعی منوریاں کے چہرے پر فوراً برس رہا تھا۔ وہ منٹ دو منٹ تک بڑے چاڈے سے خود اپنا چہرہ آئینے میں دیکھتے رہے۔ حجام جہاں دیدہ تھا۔ بھانپ ہی گیا ہو گا کہ ان کے ہونٹے بالوں میں خوردبین لگا کر دیکھنے سے بھی جوئیں نہ ملیں گی۔ اس نے پھر بھی تکلف کر ہوئے کہا۔ ہی ہی ہی ہی۔ سرکار چہرہ کیسا نکھر آیا ہے۔

منوریاں یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے کہ بھئی چلے آنا ایک آدمہ گھنٹے اپنا انعام واکرام کھی لے لینا اور ذرا بچوں کے بال بھی بڑھ گئے ہیں۔ وہ شرماتے شرماتے گھر پہنچے تو ان کی بیوی نے دیکھا کہ منوریاں اپنے سر سے علوم شریفہ کسی حجام کے ہاں چھوڑ آئے ہیں۔

بچے اچھی سیٹھی نیند کا مزہ لوٹ رہے تھے۔

اپنی بیوی کی باجھیں کھلی ہوئی دیکھ کر انھیں بڑا سکون ہوا۔ وہ دوڑی دوڑی ان کے قریب آئیں تو منوریاں ۱۰ ادغلب نظر دل سے انھیں اس طرح دیکھا کہ بیوی نے بھی تکلف بر طعن کر دیا۔

اس تہذیبی سے خاندان کا قریب قریب ہر شخص خوش ہوا۔ خسر صاحب تو پہلے ہی سے درگاہ کے سجادہ نشین اور متولی ہونے کے باوجود صف کے زنی چہرہ رکھتے تھے انھیں اپنے داماد کی اس نزکت پر اس قدر بھی پیار آیا کہ وہ سمجھتے تھے کہ منوریاں ہیں اب بہت سی تبدیلیاں آئیں گی۔ اب وہ اپنا ہر کام اللہ اور خسر کو کم سوئیں گے

اور زیادہ علی آدمی بن جائیں گے۔ ایسی بیوی اور بچوں کی ضروریات کی کفالت کو وہ ادلیں اہمیت دیں گے۔ علم کے بیکراں سمندر سے انھیں اب تک جو کچھ ہاتھ لگا ہے اس کا مول تول کرنے کے لیے وہ بھرے بازار میں نکل آئیں گے تو اہل نظر ان کے جوہر کو پکھیں گے بھی۔

لیکن منورمیاں کو عملی زندگی سے جیسے اللہ واسطے کا بیر تھا۔ فارسی اور عربی کتابیں پھوٹیں تو اب وہ انگریزی کتابوں کے ہو رہے۔ گلوڑی صفحہ میں رکھتے اور عینک سے گزر کر نظروں کی کرنیں کتاب کے صفحات کو اجال دیتیں۔

بیوی نے ایک دن دبی زبان سے احتجاج بھی کیا کہ انھوں نے جب اتنی بڑی بڑی ڈگریاں لے لیں ہیں تو اب انھیں اپاہجوں کی طرح بیٹھ رہنا نہیں چاہیے۔ منورمیاں نے محسوس بھی کیا کہ احتجاج کے پیچھے ان کی بڑھتی ہوئی قابلیت اور علمیت سے جیلنے والوں کا ایک انبوہ کثیر ہے جو ان کی بیوی کو ان کی بے عملی کے خلا اس کا مل ہے۔

وہ کچھ منعقد سے ہو گئے۔ کہنے لگے میں علم کا طالب ہوں علم کا بیوپاری نہیں ہوں۔ آج وہ بھی جیسے کچھ ٹھان کر آئی تھیں۔ کہنے لگیں۔ بیوی بچوں کے بیوپاری نہ ہو۔ منورمیاں کے لیے اب یہ بات صاف تھی کہ برس لمبرس کا دبا ہوا لاد آج لینے سارے بند توڑ کر نکل جانا چاہتا ہے۔

لہذا انھوں نے گلوڑی اٹھاتے ہوئے کہا کہ بھئی چلی بھی جاؤ۔ میرے صفحہ کیوں آتی ہو۔ مجھے آج اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ عورت واقعی ناقص العقل ہے۔

وہ لوٹنے لگیں تو کچھ بڑ بڑائی گئیں جو منور میاں کے پلے نہ پڑا۔
لیکن منور میاں نے محسوس کیا کہ داڑھی کی برکتوں سے روگردانی کر کے
انہوں نے کچھ اچھا نہیں کیا۔

ان کا وہ رعب داب ہی جاتا رہا جو ان کے نام سے شہرت پا گیا تھا۔
وہ بچے اور داڑھی دس پڑ دس کے لوگ اب بھی ان کا مان کرتے تھے۔ گھر
کے بچوں کا تو اب بھی وہی عالم تھا جو داڑھی کے وقت تھا۔
بھلیکی ہوئی ریت پر گھر وندے بن رہے ہوں۔
یا چھوٹی ڈھلکینوں میں بھر کر اس ریت کے کیک بنائے جا رہے ہوں اور
دوکان سجائی جا رہی ہو۔

حمام چینی کی رکابی اسٹیننگ بنی ہاتھوں میں گھوم رہی ہو اور صفحے سے موڑ
کی آواز نکالتے دوڑیں لگائی جا رہی ہوں۔
مکئی کے سوکھے ڈنٹھل دونوں رافوں کے بیچ اسپ تازی کی طرح چل رہا
ہوں۔

منور میاں کے ادھر سے گزرنے کی بات ہی بچوں کے کانوں تک پہنچ
جاتی تو سارے گھر وندے دیران ہو جاتے۔ سچی ہوئی دوکانیں جیسے لٹ لٹا
جاتیں۔ موڑوں کے انجن سرد پڑ جاتے۔ اسپ تازی نڈھاں ہو کر کہیں کوئی
میں اڑیاں رگڑتے۔

غرض کہ سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاتا۔ ویسے منور میاں کوئی بجا رہ تو نہیں تھے
منور میاں صرت ناشتہ اپنے عزیز واقارب کے ساتھ کرتے۔ ان کے ناشتہ

کر چکنے تک سارے بچے گرفتار کر کے کہیں چھپا دیے جاتے۔ خاندان کے دو چار آدمی ان کے دسترخوان پر ہوتے۔ بچوں کو سختی سے تاکید کی جاتی کہ منور میاں کے کھا چکنے تک کوئی بھنگی کا نام نہ بان پر نہ لائے۔ ملازمین تو خیر مزاج نہ تھے ہی۔ صبح صبح کہا کر بھنگی نہ جھلا گیا ہوتا اور منور میاں کے ناشتے کے دوران میں آدھکے کا احتمال ہوتا تو گیسٹ ہی پر ملازم کو کھڑا دیا جاتا کہ اس کو بٹھا رکھے ایسے میں ان کے کھا چکنے تک ان کی بیوی بڑی پریشان سی رہتیں کہ جاتے کب کیا ہو جائے۔

بات اصلی یہ تھی کہ بے چارے منور میاں اپنے مزاج کی نفاست مجبور تھے۔ نوالہ اٹھا رہے ہوں، کسی نے بھنگی آیا کی صدا دی۔ بس لمبو جھٹک کر ادا دل پر اور اٹھ کھڑے ہوتے۔ ایک نوالہ حلق کے نیچے پھر نہ اٹتا۔

ایسا ایک بار نہیں بار بار ہوا۔ گھنٹہ آدھ گھنٹہ کھڑے بیوی بے چارہ کی روغنیاں، روٹیاں، خالص دودھ میں سنی ہوئی پالسن کافی کا پیالہ اور نیم برشت اٹھائے جاتیں۔ منہ سمجھا کر، سنتیں کر کے کھلاتیں۔ تب کہیں انھیں سکون ہوتا۔ آخر منور میاں دن رات جو کتابیں پڑھتے گزرتے تھے۔

دماغی کام جسمانی محنت سے زیادہ تھکا دیتا ہے۔

اب اس کو کیا سمجھے کہ اتنا بڑھا لکھا عالم، فاضل آدمی بھنگی کے ہاتھوں مارا جا رہا تھا ہم غیروں کو ہمدردی ہوتی ہے وہ تو پھر بیوی ہی تھیں۔

منور میاں کو ایک اور بات سے پڑھتی۔ ان کی بیوی اور ساس سسر نے مرغیاں پال رکھی تھیں۔ کنہہ اچھا خاصا ہی جو لکھا۔ اس کے باوجود بھی انڈوں کی کمی

ہی محسوس ہوتی۔ منوریاں کے حصہ میں زیادہ ہی چلا جاتا۔ خیر ان سے کسی کا کیا مقابلہ۔ دن بھر وہ بھلے بھلے آوازیں ادا کرتی ہیں اور ان کی کتابیں اور ان کا کمرہ۔ کہیں آنا نہ جانا۔ دوپہر کے کھانے کے لیے بلایا جاتا تو نوکر ہوش ہوش آوازیں لگاتے پھرتے۔ بچے بوڑھے سب سمجھ جاتے کہ منوریاں کھانے کے لیے آرہے ہیں۔

بھئی بات یہ تھی کہ منوریاں کو بی گٹ گٹ کٹاک اور ان کے میاں مرغ کی علی الاعلان مجامعت سے کچھ گھن سی آتی تھی، مگر انکھوں سے دیکھتے جاتے اور لا حول پڑھتے جاتے۔ اس گھن کو جو اس منظر کو دیکھنے سے ان میں پیدا ہوتی تھی وہ کس شیطان کا کرشمہ سمجھتے۔ پھر اس شیطان کا نام ان کے ذہن میں کچھ اس طرح ابھرتا۔ فرائیڈ فرائیڈ۔ اور وہ فرائیڈ پر بھی لا حول بھیجنے لگتے۔

ایک دن بیٹھے بیٹھے منوریاں کو خیال آیا کہ یورپ جا کر تحصیل علم کو درجہ کمال تک پہنچانا چاہیے۔ یوں بھی یہ بات مشہور تھی کہ جو دینے کی خاک بچھو آئے اس کی عاقبت سنوڑ جاتی ہے لیکن جو لہرن کی خاک بھجوائے اس کا دلہ لکھو اس طرح دور ہو جاتا ہے کہ دونوں عالم کی زندگیاں سدھر جاتی ہیں۔

اپنی بیوی کو منوریاں تین دن تک طرح طرح سے خوش کرتے اور رہ جھان رہے۔ بات بات میں نہ صرف مسکراتے بلکہ چھیر چھاڑ کر مسکراہٹوں کا جال سا بناتے رہتے اور اس جال کے تانے بانے میں ان کی بیوی بے طرح جکڑی جاتی۔

منوریاں کے مزاج کی یہ نرمی، خشکی، یہ گرا خشکی ان کی بیوی کے دامن دل کو جیسے مونگوں اور موتوں سے بھر رہی تھی۔ ان کی بیوی کے لیے۔ ان کی تبدیلی ایک نعمت غیر مترقبہ تھی۔ کسی اچھائی کے لیے وجوہ کی ضرورت تو ہوتی نہیں جو

ان کی بیوی اس طرح سوچتیں کہ ان ہر بانیوں اور عنائتوں کا سبب کیا ہے۔ ویسے منورمیاں دل کے برے تھے بھی نہیں۔ بس ان کی اصول پنڈیاں تھیں جو انھیں شقی القلبی تک لے جا رہی تھیں یا پھر لوگ انھیں جبراً دھکیل کر ان سرحدوں تک پہنچا رہے تھے۔

کسی پر زور یا کمزور لمحے میں منورمیاں نے بیوی کے آگے اپنی تجویز رکھی تو وہ آج ہی سے مستقبل کے خواب دیکھنے لگتیں۔ کما تے دھاتے منورمیاں۔ اچھا سا سجا سجا یا گھر۔ ددڑتا بھانگتا موٹر اور ان سب پر ان کی اپنی حکمرانی۔

لیکن منورمیاں پورے پانچ سال کے بے جاتے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اتنی لمبی مدت۔ اس پر اتنا درد دراندہ کا سفر۔ اس خیال اور تصور سے ان کی بیوی آنکھیں نہ ملا سکیں۔ اور شفاف شفاف سے آنسو موتیوں کی طرح ڈھلکنے لگے۔ منورمیاں کے اتنے دن کے چاؤ اور محبت نے جن مونگوں اور موتیوں سے اپنی بیوی کے دامن دل کو بھر دیا تھا انھیں موتیوں میں سے چن چن کر جیسے وہ منورمیاں کو لوٹا رہی تھیں۔

”وہ نہ یوں ہی کس کام کے جو آپ کے کام نہ آئیں اور پھر آپ یہ سب کچھ ہمارے لیے ہی تو کر رہے ہیں۔“

”الشریبہ نظر رکھیے۔ وہ بڑا کارساز ہے۔“

واقعی خود منورمیاں پر کبھی کبھار رقت سی طاری ہو رہی تھی۔

اس طرح منورمیاں کے خیالات عوام میں بدل گئے۔ ان کی بیوی نے اپنے ماں باپ کو بھی آمادہ کر لیا۔ منورمیاں کے لندن جانے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

تو ہمیں بھر کے اندر اندر ان کے خواب تعبیر کی صورت میں ڈھل رہے تھے۔
 سوٹ، موزے، ٹائیاں، شوز ایک ایک چیز خرید لی گئی۔ ان دنوں پتلون
 کے گیلے لگتی تھیں۔ ڈھب سے گیلے لگانا تک انھیں نہ آتا تھا۔ اور پھر آئے بھی تو
 کیوں۔ انھیں کیا پڑی تھی جو ان بدعتوں کے پیچھے سر مار تے پھرتے — شرعی
 پاجامہ ابھی انھوں تک آسکا تھا۔ وہی کیا کم تھا۔

ان کے جانے کا دن آیا تو ایک دوست نے ان فراموش کو پورا کیا۔ بنا
 سوار کر جب منور میاں کو ان کے کمرے سے باہر لایا گیا تو واقعی وہ "فل سٹا"
 میں بڑے وقیع اور معتبر سے لگ رہے تھے۔

ان کی بیوی نے انھیں آبدیدہ ہو کر بڑی محبت سے دیکھا۔ اس نے بلائیں
 لیں۔ خسر نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے — خاندان بھر کے چھوٹے بڑے مرد
 اور عورت بھی جمع تھے۔ منور میاں بڑی تکنت اور وقار سے نگاہ غلط اندازہ
 ہر ایک پر ڈال لیتے۔ بہ مشکل ایک آدھ آدھ روپے جملے سے کسی کو نواز دیتے۔
 کسی کی بات سنی ان سنی کر دیتے اور آگے بڑھ جاتے۔ ان کی تکنت کا یہ حال
 تھا جیسے وہ لندن جا نہیں رہے ہوں بلکہ وہاں سے سارے یورپ کی ڈگریاں
 بڑھ کر واپس آ رہے ہوں۔

جب وہ اپنے بیمار بچے سے ملنے کے لیے اس کے پلنگ کے قریب پہنچے
 تو بڑی سنجیدگی سے اپنی چھڑی سے اس کے گال چھو لیے — اور بس۔
 کسی بڑی بوڑھی نے کہا بھی کہ میاں سا لہا سال کیلئے اتنے دور دراز جا رہے
 ہو تو بھلا اپنے نکت جگر سے ڈھنگ سے قول لو۔ ذرا اس کے تسلی ہی دو۔ بیٹا

تو جلد ہی اچھا ہو جائے گا۔ لیکن اس جہم غفیر میں بوڑھی کی آواز کسی نے سنی کسی نے نہیں۔ لیکن منور میاں تو بس اس طرح مطمئن سے لوٹ گئے۔ جیسے انھوں نے بہت کچھ کر دیا ہے۔ اور یہ ان کی اصول پسندی تھی۔ اب لوگ کچھ بھی سمجھیں۔ ان کی جدائی کا منظر بھی بالکل وہی تھا جو ایسے مواقع پر دیکھنے میں آتا ہے۔

لیکن خاندان بھر کے سارے بچوں کی کانفرنس میں بلا اختلاف رائے یہ بات طے پا گئی تھی کہ منور میاں کے جاتے ہی آج کا دن ان کی قید و بند کی زندگی میں مکمل آزادی کا تصور لے کر آئے گا۔ اور پھر یہ جو اہلی کے بڑے بڑے دوست ہیں ان پر کچی پچی امیاں رہیں گی اور نہ امر و د کے درختوں پر بارغ کے پانی کی حکومت چل سکے گی جو ناگ سانپ کی طرح چھن کھولے رکھوالی کرتا رہتا ہو۔ ایک صاحب نے تو یہ رائے بھی دی کہ موسمی اور سنگتوں کے سارے بیڑوں پر جو کانٹے ہیں ان کو بلیڈ سے چھیل کر ان درختوں کو اس قابل بنا دیا جائے کہ ہم جب چاہیں ان پر چڑھ کر سارے پھلوں کا صفایا اوپر ہی اوپر کر سکیں۔

منور میاں کی بیوی اور ان کی ساس کے دل اس جدائی سے مغموم تھے لیکن اس غم کے پیچھے ایک درخشاں مستقبل کی جوت بھی تھی جو تسلی دیتی اور اس بندھائی تھی۔ منور میاں کے دوست احباب ان کی متواضع فطرت کے گرویدہ تھے۔ دست کے پھرنے کا غم انھیں بھی تھا لیکن ساتھ ہی اس بات کی خوشی بھی تھی کہ جب وہ لوٹیں گے تو محفلیں اور اہتمام سے سجھیں گی۔

لیکن منور میاں کے بچے خاندان بھر کے دوسرے بچوں کے ساتھ مل کر یوم نجات منا رہے تھے۔

بچے بے چارے شاید حق بجانب ہی تھے۔ اس لیے کہ منور میاں کی نسبت یہ بات عام تھی کہ اکھنوں نے کبھی بچوں کے سر پر ہاتھ نہ رکھا، نہ گال چھوئے نہ پیار کیا۔ ہاں ڈانٹ ڈپٹ ضرور کی اور اکثر کی۔ کبھی کبھی تو معمولی قصور پر بھی کچھ زیادہ ہی سزا دی۔ مارا پیٹا۔ دن دن بھر کمرے میں بند کر دیا اور خود کتابوں میں گم ہو کر سب بھول بھال گئے۔

ایسے میں ان کی بیوی کی بھی مجال نہ ہوتی جو بلا اجازت قید سے ان کو نکال لاتی۔ وہ بس تڑپ تڑپ کر کمرے کے دروازے سے لگی آنچل سے اپنے آنسو خشک کرتی رہتیں۔

بہر حال منور میاں آج جدا ہو رہے تھے۔ تو ان کی اس جدائی سے کوئی غمگین تھا تو کوئی خوش بھی تھا۔

اب ان کی بیوی بس ڈاکیے کا انتظار کیا کرتیں۔ بچوں کے لیے منور میاں کے غائبے جہاں ساری آزادیاں دے دی تھیں وہیں ایک بالکل انوکھے قسم کی لذت سے انھیں آشنا کر دیا تھا۔ اور وہ لذت تھی کہ ایک اکٹی اور دنی پا جانے کی خوشی۔ منور میاں کی بیوی نے یہ کہہ رکھا تھا کہ جو بچہ میاں کا خط لے کر آئے گا اس کا منہ میٹھا کر ایا جائے گا۔

یا تو منور میاں کے رعب داب نے انھیں جکڑ رکھا تھا یا اب ان کے خط کے انتظار نے ان کے کھیل کو دکا بہت سادقت اپنے لیے مختص کر لیا تھا۔ صرف فرق تھا تو مجبوری اور مختاری کا۔ غلامی اور آزادی کا۔ جبر اور اختیار کا۔ منور میاں کے خط کا انتظار سب کے سب بڑی لگن سے کرتے۔ ہر ایک دوسرے

پر بقت لے جانے کی کوشش میں گریٹ کے چکر کاٹتا رہتا کہ کہیں ڈاکیہ نہ آجائے
در خطہ دوسرے کے ہاتھ نہ لگ جائے۔ اسی خطہ کے بہانے اب ان کے قدم
گریٹ سے باہر نکل آئے۔ پھر بستی تک جا پہنچے۔

منوریاں کا خط آیا تو انھوں نے بیوی کو بہت کچھ لکھا تھا۔ آخر میں یہ
لکھی لکھا تھا کہ اس سرزمین انزنگ پر میں نے ہیلا سجدہ کیا ہے۔

پھر جب بھی منوریاں کا خط آتا، بچوں کو کبھی دو نیاں ملتیں، کبھی برت کے
لڑو، کبھی مٹھائی کے دوسنے،

اس طرح منوریاں کے خط ان کی نظروں میں منوریاں سے بہتر ٹھہرے۔

دو سال گزر گئے تو خاندان بھر میں مٹھائی تقسیم کی گئی۔ منوریاں

کی بیوی اور ان کی ساس نے نماز شکرانہ ادا کی۔ منوریاں نے لکھا تھا کہ ”میں

آکسفورڈ یونیورسٹی سے ایم۔ اے کی ڈگری لے چکا ہوں۔ اب پی۔ ایچ۔ ڈی

کی تکمیل جلد سے جلد کر لوں گا اور لوٹ آؤں گا۔ ارادہ ہے کہ یہاں سے

لوٹے ہوئے بہت ساری چیزیں لیتا آؤں۔ گھر کی تزئین و آرائش کے

لیے یہاں جو نئی نئی چیزیں ملتی ہیں ان کا وہاں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

تھائے اور بچوں کے لیے تو ایسی ایسی چیزیں لیتا آؤں گا کہ خاندان بھر میں دھوا

مچ جائے گی۔ اور ہاں کبھی کسی اچھے سے خوبصورت گھر کی تلاش شروع کر ادو

اب تجھے پر دینسری کرنی ہے تو ڈھنگ کا گھر چاہیے۔ گھر ہی پر ایک اچھی سی لائبریری

چاہیے۔ اچھا سا ڈرائنگ روم چاہیے۔ ڈائمننگ روم بھی ہو، اس کے بغیر

اب میرے لیے کھانا مشکل ہو جائے گا۔ گھر بالکل انگریزی دفعت کا ”سائڈرن“ ہو۔

اب اس قبرستان میں رہ کر بھلا میں کیا کر سکوں گا۔ اور اگر تم سچ پوچھو تو یہاں آنے کے بعد مجھے تو سارے کا سارا ہنردستان ہی قبرستان نظر آتا ہے۔“

آخری جملہ منورمیاں کی بیوی کو کچھ بھایا نہیں پھر بھی یہاں سے وہاں تک دور دور تک، حد نظر تک چاندنی ہی چاندنی تھی جو ان کی آنکھوں کے آگے بچھو ہوئی تھی۔ اس ٹھنڈی اور سہانی چاندنی میں ان کو اپنا خوبصورت مستقبل بالکل صاف اور واضح دکھائی دے رہا تھا۔

منورمیاں نے اپنے گھر کا سارا نقشہ کھینچ کر خود ہی کھجوا یا تھا۔ اب جو کمی رہ گئی تھی اس کی تکمیل کے لیے منورمیاں کی بیوی تصور ہی تصور میں اس نقشے میں رنگ آمیزی کرتی رہتیں۔ کہ یکایک ایک نئی نوپلی تھر۔ برلی جس میں لکھا تھا کہ میرے دوست منور علی خاں پر فارج کا حملہ ہونے سے انھیں ہاسپٹل میں شریک کر دیا ہے۔ انھیں لکھنے پڑھنے سے ڈاکٹر دن نے منع کر رکھا ہے۔ وہ روز صحت ہیں۔ تردد و فکر کی کوئی بات نہیں۔ الٹ پر نظر رکھیے اور ان کے لیے دعا کیجئے۔ وہ بہت جلد اچھے ہو جائیں گے۔

خط ملا تو جیسے چکی ہوئی چاندنی کو کالے کالے بادلوں نے چاند سے اس طرح علاحدہ کر دیا کہ نہ چاندنی کا وجود رہ گیا نہ چاند کا۔

اسی دن کے سارے لاڈلے شکرنا امید کے جنازے بن بن اٹھتے رہے۔ منورمیاں کی بیوی اور منورمیاں کی ساس سسر اس درگاہ کا طواف کرتے رہے جس درگاہ کے سہارے ان کی زندگی کے اچھے دن وابستہ تھے۔ پھر یکایک معلوم ہوا کہ منورمیاں لوٹ رہے ہیں۔ ڈاکٹر دن نے اب انھیں وہاں

رہنے سے منع کر دیا ہے۔ قہر کے بعد وہ اتنے کھردر ہو گئے ہیں کہ ڈاکٹر دلوں کا خیال ہے کہ اب وہ دلوں کے موسم کی شدت کو برداشت کرنے کے قابل نہیں رہے ہیں۔ ان کے لیے اپنے وطن کو لوٹ جانا ہی بہتر ہے۔

منورمیاں لوٹ آئے تو اُس دن میں اور اس دن میں کوئی خاص فرق نہیں تھا جس دن وہ اپنا وطن اور گھر بار بھڑک کر پردیس گئے تھے۔ اور آج جب کہ وہ اپنے دیس میں، اپنے گھر میں، اپنے بیوی بچوں میں لوٹ آئے تھے تو میدان جنگ سے بھاگے ہوئے سپاہی کی طرح اس کی بہادر بیوی نے اس کے زخموں کی مرہم پٹی اس لیے نہیں کی کہ زخم پیچڑ پر تھا سینے پر نہیں تھا۔

یہاں پہونچے تو اپنے وطن کی آب و ہوا انھیں راس آئی۔ وہ دن بدن صحت مند ہوتے گئے۔ وہ پیرجن کے سہارے دیر تک کھڑا رہنا اور چلنا پھرنا ان کے لیے مشکل تھا تیز گامی کی طرف مائل تھے۔ اب وہ چھڑی ٹیکے بغیر بھی چل لیتے۔ منورمیاں کی بیوی کے دل پر بچھائے ہوئے بادل اب پھر ٹھپٹ رہے۔ کتے اور چاند بادلوں کی ادٹ سے کچھ اس طرح تاک بھانک کر رہا تھا جیسے موقع کی تلاش میں ہو کہ چپکے سے دل کی ساری دھرتی کو اپنی نورانی چادریں لپیٹ سمیٹ لے جلتا بنے گا۔

اور منورمیاں کی بیوی اس چاند کی ایک ایک کرن کو پکڑ کر اپنے غم کو دل میں محفوظ کر لینا چاہتی تھیں۔

ان کونوں میں جتنے رنگ تھے ان رنگوں سے ان نقشوں میں رنگ آمیزی کرنا چاہتی تھیں جو منورمیاں نے بڑے چاؤ اور بڑے جتن سے اپنے خطوط کے ذریعہ لکھیں

تحفے میں بھیجے تھے۔

لیکن منور میاں بے چارے پھر اس ہندوستان کے ایک قبرستان میں آجسے تھے جو سارے کا سارا خود ایک ہی قبرستان تھا۔

اب انھیں بہر حال یہیں زندگی تلاش کرنی تھی۔ فی الوقت ان کا معمول یہ تھا کہ صبح اٹھتے ہی بڑی پیٹتے۔ پھر حواج ضروریہ سے فارغ ہوا کہ سوٹا پہننے پڑے۔ اتہام سے ڈالی باندھتے یا بول لگاتے اور بڑی تکنت سے چوتھے پر قبروں کے پنج بجھی ہوئی کرسیوں پر جا براہتے۔ کچھ دیر خشک انگریزی اخباروں کا مطالعہ کرتے پھر ان کے دوست و احباب کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔

منور میاں کے پہلو دار شخصیت، ویسے تو پہلو در پہلو تھی لیکن ان کی شخصیت کے دور رخ بڑے متضاد تھے۔ وہ شخص جو اپنے ہوی بچوں میں اصول پرندی کے نام پر شقی قلبی کی سرحدوں تک جا پہنچا تھا۔ اپنے دوست احباب یا بڑا ہی سر بجاں مرنج، متواضع اور منکسر المزاج سمجھا جاتا تھا۔

دوستوں کی تواضع کر کے، انھیں کھلا پلا کے ایک عجیب قسم کی خوشی انھیں محسوس ہوتی۔ ایک ایسی خوشی جس کی لذتوں سے صرف جذبات آشنا ہوتے۔ اظہارِ مکن نہیں ہوتا۔ منور میاں نے برے دن کم ہی دیکھے تھے۔ اچھے دن کبھی اچھے نہ رہتے تھے تو برے دنوں سے دُور ہی رہے۔ اب ان اچھے اور برے دنوں کے ہیر پھیر میں ان کے ساس سسر کا خیال یہ تھا کہ منور میاں کے دن خواہ وہ اچھے ہوں یا برے خود ان کے اپنے تو ہیں نہیں۔ خود ان سے منسوب کیے جائیں وہ تو بس اس طرح آن بے تھے جیسے گھر دامادی پہلے ہی سے طے تھی۔ ایسے میں اچھے دن اگر ساس سسر کے ہوں تو ان کے

بھی ہوئے، برے دن اگر ساس سسر کے ہوں تو ان کے بھی ہوئے۔
 بات کچھ بھی ہو لیکن ایسا ضرور تھا کہ نورمیاں کماڈپوت بھی ہوتے تو ان کی
 شخصیت، ان کے دوست احباب کے لیے جیتاں نہ ہوتی جو آج نہ کمانے پر ساس
 سسر اور بیوی بچوں کے لیے بنی ہوئی ہے۔

دوست احباب سے جو وقت بچتا وہ کتابوں کی نذر ہو جاتا۔ یورپ جانے
 سے قبل کتابوں کی یہ رفاقت ان کی بیوی کو سو سو طرح کھلتی تھی۔ لیکن جب انھوں
 نے آکسفورڈ سے ایم۔ اے کامیاب کیا تو بیوی سمجھ گئی کہ اس کامیابی میں کچھ ان
 کتابوں کا بھی دخل ہے جو بڑی بے ترتیبی اور کس سپرسی کے عالم میں پڑی نورمیاں
 کی منتظر تھیں۔

ان کی بیوی نے بھڑک بھڑک کر ایک بار انھیں قرینے سے جمایا بھی تھا۔
 لیکن آج کتابوں کی طرف نورمیاں کی واپسی ان کی بیوی کے لیے واقعی ایک
 سانحہ تھی۔ ایک ایسا سانحہ جو ماضی کی پھوٹی بڑی ساری محرمیوں کو دہرانے کے درپے
 ہوں ایک ایسا سانحہ جو بجائے خود ماضی اور مستقبل بن کر مقدر بن گیا ہو۔

یورپ سے لوٹے تھے تو پان کی گلیوں کو ”بڈی“ نے اس طرح نکال پھینکا
 تھا جیسے گوری فرنگ ہندوستانی کلمہ ہی کو گھر سے باہر کرتی ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ
 نورمیاں نے دونوں میں سمجھوتہ کر دیا۔

اب گلیاں بھی تھیں۔ ”بڈی“ بھی تھی۔

چلے خواہ دن میں سو بار منگوائی جائے نورمیاں کی بیوی اسے ”بڈی“ ہی کہتیں۔
 اور یہ سلسلہ دن بھر کچھ اس طرح چلتا کہ نورمیاں کی بیوی ”بڈی“ گلیوں اور

کتا بول کے درمیان معلق معلق سی لٹکا کر تیں۔

منوریاں کے ایک پر وغیرہ دوست نے انھیں لکھا کہ میں تمہارے لیے یہاں
بینورسٹیاں بہت کچھ کر سکتا ہوں۔ تین ساڑھے تین سو روپے تو تمہیں بہر حال
مل ہی جائیں گے۔ اس کے بعد اسٹرا مالک ہے۔ پہلے قدم تو جم جائیں۔

جس وقت خط پہنچا ہے اس وقت منوریاں حسب دستور فل سوڑے پینے
ہوئے اپنے دوستوں کے ساتھ جو تیسے پر قبروں کے بچوں پنج بیٹھے تھے۔
خط پڑھ کر وہ مسکرائے۔ اس مسکراہٹ میں طنز تھا۔ حقارت تھی۔ پھر اپنے احباب
سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔

دامغ خراب ہو گیا ہے۔ اکمل کمال عرشی کا۔

احباب نے پوچھا۔ آخر کیا بات ہے۔ اور یہ کون صاحب ہیں۔

منوریاں کہنے لگے کبھی آکسفورڈ میں مجھ سے دو سال سینئر تھا۔ معاشیات سے
ڈاکٹریٹ کیا ہے۔ آدمی بڑا پر خلوص ہے۔ اسے بہت محبت ہے مجھ سے۔ دراصل
بات یہ ہے کہ جب وہ ڈاکٹریٹ کر رہا تھا اس کے تھیسس میں نے ہی لکھے تھے اور
اس کو نوری منظور کر لیا گیا۔ میرا بڑا معترف ہے۔ ہمیشہ کہتا تھا کہ تم نہ ہوتے تو جانے
کب میں ڈاکٹر ہوتا۔

منوریاں ڈاکٹر نہ ہو سکے تھے تو اس طرح اپنے ساتھی ڈاکٹروں پر اپنی ذہنی
جھلا کر شاید اپنے نفس کی تسکین کا سا انہیں اکر لیتے۔ ان کی ایسی شہمی میں ان کی محدود
صداقت بھلک پڑ تیں۔

ایک صاحب نے پوچھا۔ ”پھر کیا کوئی بد تیزی کی ہے انھوں نے“

”میں بھی بدتمیزی کیا کرے گا وہ مجھ سے۔ ہزار پندرہ سو تو کم تا ہی ہوگا۔
بروقسیم جو ہے۔ اب مجھے لکھا ہے کہ تین سو ساڑھے تین سو کی کچھری قبول کر لوں۔
اتنا گیا اگر اتنا تو نہیں ہوں میں“

”ہاں بھی تین سو ساڑھے تین سو ماہانہ تو آپ یورپ جانے سے پہلے لے سکتے
تھے“ ایک صاحب نے ہاں میں ہاں ملا کر حق دوستی ادا کیا۔

منورمیاں کہنے لگے۔ بات حقیقتاً یہ ہے کہ میرا بہت مان کرتا ہے۔ وہ چچا
ہے کہ میں یونیورسٹی میں پڑھاؤں تو ملک و قوم کا بھلا ہوگا اور آنے والی نسلیں ایسی
نکلیں گی کہ ہم ان پر غرہ بھی کر سکیں تو کم سے کم اعتماد تو کر سکیں گے۔

تو پھر کیا سوچا ہے تم نے۔ ایک بے تکلف دوست نے پوچھا جن کے پاس کوئی ڈگری
نہیں تھی لیکن وہ گورنمنٹ میں سات سو روپے کے ملازم تھے۔

بھی اس میں سوچا کیا ہے۔ میں تو اچھا کر دوں گا۔ میں اپنی صلاحیتوں کو
اس طرح برباد کرنے سے تو رہا۔ ملک و قوم کا بھلا دیکھوں تو لیڈر نہ بن جاؤں۔
مجھے تو اپنا علم بانٹنا اور تقسیم کرنا ہے لیکن اس طرح بھی نہیں۔ آخر میرے بھی تو
بال بچے ہیں۔

اور منورمیاں نے دھڑ سے انکار کر دیا۔ صاف لکھ دیا کہ مجھے بروقسیم مل سکے
تو بہتر ورنہ مجھے معذور سمجھو۔ اپنی صلاحیتوں اور زندگی کو میں اتنے سستے داموں نہیں
بیچ سکتا۔

سائرس نے جب یہ سنا تو دل ہی دل میں کاہش کھا کر رہ گئے، منہ کھول کر یہ
بھی نہ کہہ سکے کہ صاحبزادے اپنی قابلیت پر اتنا غمنہ بھی نہ کرو۔ زمانہ نازک سے گزر رہا ہے۔

تر آ رہا ہے۔ آج جو دن کے اجالے ہیں وہ کل کے اندھیرے بن رہے ہیں۔

بیوی نے محسوس کیا کہ منورمیاں ٹھیک کر رہے ہیں۔ اتنا سب کچھ پڑھ لکھ کر صرف تین ساڑھے تین سو روپے پر کون اوقات خواب کرے۔

لیکن جب خط لکھ کر منورمیاں لفافہ بند کرنے لگے تو ان کی بیوی کے دل میں خیال گزرا کہ ہاتھ پکڑ کر منورمیاں کو لفافہ بند کرنے سے روک دیدیں۔ اور انھیں بتائیں کہ دیکھو تو یہ تمھارے بچے کیسا پھوٹ پھاٹ کر بڑھ رہے ہیں۔ یہ مونا تو کیسا قدر نکال رہی ہے۔ لیکن منورمیاں لفافے کا گوند زبان پر پھیر کر اسے بند کر چکے تھے۔

سننے ہیں کہ منورمیاں نے ایسی ہی کئی نوکریوں کو ٹھکرا دیا تو شاید نوکریوں نے بھی مل جل کر سازش کر لی اور منورمیاں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دور رکھا۔

تیرکمان سے نکل جاتا ہے تو حیدر کے بیوی سے ہو کر ہی سہی مل تو سکتا ہے لیکن یہ نوکریاؤں کا گھائل خود ہی ہوتا ہے جو اسے کھودیتا ہے۔

اور اب منورمیاں کی سمجھ میں یہ بات آچکی تھی کہ یہ سب کچھ انھوں نے کھودیا ہے۔ اور یہ سب کچھ اس قدر تیزی سے ہو گیا کہ منورمیاں بے چارے قبروں کے بچوں کی طرح اپنے نکلائی اور پتلون کی کریمز درست کرتے رہ گئے۔

چار دن کے مونیہ نے منورمیاں کے خسر کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند کر دیں تو جو تر کے بچوں پنج وہیں دفنائے گئے جہاں منورمیاں کی بیٹھک بنی ہوئی اور کرسیاں بچھتی تھیں۔ منورمیاں زندگی کے کسی حادثے کے آگے سر ہٹا دینے والے نہیں تھے۔ اپنے کسی پیارے کی موت زندگی پر وار کر سکتی ہے۔ گھاؤ لگا سکتی ہے۔ بہت کیا تو ایک آدھ ناسور کہیں رکھ چھوڑا لیکن سرے سے زندگی کے قدم پکڑ کر اس کو پتہ تو نہیں لگا سکتی

منورمیاں کو یہ گھاؤ وقت کے ہر ہر قدم پر لگتے گئے۔ انھوں نے باپ کی محبت اگر دیکھی تھی تو اپنے خسر ہی کے روپ میں۔ اور اس روپ نے انھیں ہر قسم کا اطمینان دے رکھا تھا۔ آرائش دے رکھی تھی، لیکن اب وقت ان سے اپنی ناقدری کا امتحان لینے کے لیے جیسے مسلح ہو کر آیا تھا اور انھیں لٹکار رہا تھا۔

منورمیاں نے جب یہ لٹکار سنی یہ تو ان میں ٹائی بانہٹنے کی ہمت نہ رہی کریمز کیا سوٹ ہی کہ وہ بھول بیٹھ چیکے سے اشارہ کر کے بیوی کو جیسے منع کر دیا کہ ”بڑی“ پٹینے پیارے وقت نہیں ہے۔ اور تیس عالم میں بیٹھے تھے اسی عالم میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ علی کو پکارا اور لٹکارتے ہوئے نبرد آزمائی کے لیے کو دپڑے۔ لیکن ان کے پیروں میں ریشہ تھا۔ ان کا ہاتھ مفاروج تھا۔ وقت نے انھیں معاف نہیں کیا بڑے گھر سے گاؤں لگائے۔ خون رسی لگا تو نہ خیم بھر سہل نہ ہوا۔

منورمیاں کے برادر نسبی جب ان کے خسر کے بعد درگاہ کے سجادہ نشین قرار پائے تو اس قبرستان سے منورمیاں کو اپنی زندگی کا ناٹھ توڑ لینا پڑا۔

وہ ایک چھوٹا گھر لے کر آگ بجا بیٹے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کا ایم۔ اے کاٹوں ان کی زندگی کا سب سے بڑا انعام تھا۔ ایسا انعام جسے آدمی اپنی صحت دے کر حاصل کر لے دو سرے معنوں میں زندگی دے کر۔

انھوں نے بھجڑا پوچھ کر اس گون کو نکالا جس پر بے بیوی کا جھبہ بنا کر کھیلے تھے دھو دھلا کر ان کی بیوی نے گون کو کھونٹے سے ٹکڑا دیا۔ یہ گون منورمیاں کا علم تھا۔ ان کا ادراک تھا، ان کا فلسفہ تھا۔ ان کی تفصیل اور عظمت تھا جو ادارے کی دیواروں پر بھول رہا تھا اور یہی گون ان کے ایم۔ اے ہونے کی دلیل تھا۔ کوئی ڈگری کسی نے

ان کے پاس نہیں دیکھی۔ نہ خود انھوں نے ہی دکھانے کی کوشش کی۔

اس طرح انھوں نے بی۔ اے اور ایم۔ اے کی درس و تدریس کے لیے ایک خانگی ادارے کی بنیاد ڈالی۔ لیکن انھیں حسرت ہی رہی کہ ادارے کے نام کا بورڈ بنوا کر اپنی ڈگری اور اپنے نام کے ساتھ باہر لگا سکتے تاکہ ان کی ڈگری دیکھ کر شاگردین علم کا اشتیاق بڑھتا۔ کوئی بھولا بھٹکا طالب علم کسی نہ کسی طرح اس درس گاہ کے دروازے تک آ پہنچتا تو منورمیاں بڑے چاڑھے بڑی شفقت اور محبت سے اسے اپنی درس گاہ میں کھینچ لاتے اور اس کو علم کے بیکراں سمندر سے چُن چُن کر وہ سارے موتی دے دیتے جن کی آب و تاب کے سہارے زندگی کے بھرے بازار میں وہ ان کے کھرے کھرے دام وصول کر سکتا۔ کم سہی لیکن جتنے بھی شاگرد منورمیاں کے نکلے ہیں ان میں سے اکثر اپنی اپنی یونیورسٹی کے لیے قابل سمجھے گئے۔ اور اچھی خدمتیں پائیں۔ اور اس فخر نے منورمیاں کی گردنوں کو کچھ ایسا دلا سے دیا کہ ان کی زندگی کے دنوں میں کچھ اضافہ ہو گیا۔

لیکن پھر ان کی صحت بہت تیزی سے ان کا ساتھ چھوڑ رہی تھی۔ اپنے ٹیچم شیجم جسم کا بوجھ اٹھاتے غالباً ان کے پیر تھک گئے چنانچہ پیروں نے ہی سب سے پہلے ان کا ساتھ چھوڑا اور وہ چلتے پھرنے سے معذور ہو گئے۔

پھر بلڈ پریشر کا عارضہ لاحق ہوا۔ پھر صنف النفس نے ان کی ساری ہستی کو اٹھل پھل کر رکھ دیا۔

درس و تدریس اب منورمیاں کے بس کا روگ نہ تھا۔ صرت آنکھیں تھیں جو ان کا ساتھ دے رہی تھیں۔ منورمیاں یورپ سے جتنے فلسفے آئے تھے ان سب

فلسفوں کے رد عمل نے انھیں مذہب سے قریب ترک کر دیا تھا۔ زندگی کی تشنگی اور ہر محرومی پر انھوں نے خدائے غر و جبل کا شکر ادا کیا اور یہی ایلان کا شمار بن گیا تھا۔

قادِ مطلق پر اتنے مکمل ایتقان اور اتنے مستحکم ایمان سے پتہ نہیں آدمی کا اعتماد اپنی ذات پر سے اکٹھ جاتا ہے یا عشرتِ قطرہ ہو کہ دریا میں فنا ہو جانے ہی کو حاصلِ زینت سمجھتا ہے۔ بہر حال کچھ ہو سب کچھ چھین جانے کے بعد بھی جائنتی اور جھجکتی ہوئی آنکھیں منور میاں کے ساتھ رہ گئیں تو انھوں نے رب العزت کا سو سو طرح شکر ادا کیا کہ انہی آنکھوں کے سبب ان کی کتابیں آج بھی ان کی رفیق تھیں، مولنس و غنوا رکھتیں۔

لیکن یہی آنکھیں منور میاں کے لیے غم و اندوہ کا ایک ایسا تحفہ بن جاتیں کہ ان کی ساری کتابیں ان کے برابر، ان کے سر پر، ان کے اطراف چھوٹی چھوٹی قبروں کی مانند بکھر جاتیں۔ اور ان قبروں کے پاس سے ان کی جوان جوان بیٹیاں کچھ اس طرح گزرتیں جیسے اپنی جوانیوں کو ان کی کتابوں میں تلاش کرتی پھر رہی ہوں۔

منور میاں آنکھیں بن کر لیتے، گرہ کر اٹاتے۔ یا اللہ مجھ سے میری آنکھیں چھین لے لیکن پھر سنبھل جاتے۔ تو یہ استغفار کر کے اپنی بھینگی ہوئی آنکھوں کے کناروں کی بنی کو اپنے دامن میں چھپا لیتے۔ پھر گرہ کر اٹاتے۔

یا اللہ مجھے معاف کر دے۔ یہ کفرانِ نعمت ہے۔

اب وہ چاہنے لگے تھے کہ زمانے بھر کی محبتیں بٹور کر چھپے چوری اپنے

والی بچوں میں تقسیم کر دے اس لیے کہ خود ان کے پاس دینے کے لیے اب کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ وہ شخص جو خود دوسروں کے لیے قابلِ رحم ہو وہ کسی کو کچھ بھی نہیں دے سکتا۔ یہاں تک کہ محبت بھی نہیں اس لیے کہ وہ غرض منہ سمجھا جاتا ہے۔ پڑھتے پڑھتے سو جانا۔ سوتے سوتے آنکھیں کھول کر اپنی کتابوں میں کھو جانا۔ اب یہی سب کچھ ان کی زندگی میں رہ گیا تھا۔

یہ نہیں اب بھی کتابیں انھیں کچھ دیتی تھیں یا وہ خود ہی اپنی آنکھوں کی جوت ان کتابوں کی پیمینٹ کر رہے تھے۔

ایک رات جب وہ تھکے ہوئے تھے اور محل دکھائی دے رہے تھے ان کی بیوی اور بچوں نے انھیں کتابیں دیکھنے سے منع کیا۔

چپ چاپ فرمانبردار بچے کی طرح انھوں نے کتاب رکھ دی کھوٹی کھوٹی آنکھوں سے سب کو دیکھا، اپنی بیٹیوں پر نظر اٹھی تو جیسے وہ ان سے آنکھیں چرا رہے تھے۔ پھر انھوں نے آنکھیں بند کر لیں۔

اب کی بار کسی نے نہیں دیکھا کہ آنکھیں بند کرنے کے بعد آنکھوں کے کناروں کی نمی کو انھوں نے اپنے دامن سے پونچھا بھی۔ صبح ہوئی تو اپنی آنکھوں کی بوت وہ کتابوں کی نذر کر چکے تھے۔ کتابیں ان کے آس پاس پھیلی ہوئی تھیں۔ پھوٹی پھوٹی قبروں کی طرح جن میں زمانے بھر کا علم دفن تھا۔ نئے پرانے سارے فلسفے دفن تھے۔

منوریاں نے اسی قبرستان سے اپنا ناطہ پھر سے جوڑ لیا جو انھوں نے مجبوراً توڑ لیا تھا۔ لیکن اس چبوترے پر انھیں جگہ نہیں ملی جہاں بیٹھ کر وہ اپنی کتابوں کے بل بوتے پر اس ناقہ رشتاں کی زندگی کے منہ پر تھوک دیا کرتے تھے۔

بھنیں چبوترے کی حصار کے باہر ہی دفن کر دیا گیا۔
 سُنتے ہیں پڑوس کے درزی کے کسی کھلنڈرے لٹکے نے ان کے سر بانے دیوار
 پر ٹیڑھے میڑھے خط میں کتبے کی طرح حاشیہ بنا کر لکھ چھوڑا ہے۔

میر سنور علی خاں مرحوم

ایم۔ اے (اگسٹ)

یہ لڑکا اپنے کسی ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ میرے باپ نے ہی سنوریاں کا ایم۔ اے

کا گاڈن سیاتھا۔

شکن در شکن

”میں کیا کرتا بھلا۔۔۔“

”میں نے قرآن سر پر اٹھا کر قسم کھالی کہ وہ بچہ میرا نہیں ہے۔“
اتنا کہتے کہتے وہ آئیدہ ہو گیا۔

آدمی زندگی بھر جھوٹ بول سکتا ہے۔ لیکن آفسو کبھی جھوٹ نہیں بول سکتے۔

مجھے داحصف سے جبرزدی تھی۔ وہ اتنا بامروت اور اس قدر نرم آدمی تھا کہ اس پر لگائے ہوئے اہتمام کو وہ اپنے سر بھی لے سکتا تھا۔ میں نے ایسا آدمی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔ آپ خنجر لے کر اس کے سینے پر سوار ہو جاسیئے وہ آپ کی کلائی مرد ٹکڑے خنجر آپ سے پھین لینے کی کبھی کوشش نہیں کرے گا۔ آپ سے التجا کرے گا کہ بھئی مجھے چھوڑ دو۔ پھینا پھینا میں کہیں تمہارا رابطہ نہ بنی نہ ہو جائے۔

وہ نہ رہے ہوئے گلے سے کہنے لگا کہ کیا تمہیں بھی میری بات کا یقین نہیں ہے۔“

میں نے اس کو تسلی دی۔ ”یار مجھے تمہاری بات کا اتنا ہی یقین ہے جتنا خود
تمہاری بھیسکی ہوئی آنکھوں کو ہے۔ لیکن۔۔۔“
”کہہ بھی چکو بیٹی۔۔۔ یہ لیکن کیا ہے؟“
”لیکن۔۔۔ یہی کہ مجھے تمہاری یہ بزدلی پسند نہیں ہے۔“

وہ بچوں کی طرح رونے لگا۔۔۔

”تم اسے بزدلی کہتے ہو۔ جھوٹ سے انکار بزدلی نہیں ہے؟“

”میں نے کب کہا۔۔۔ جھوٹ سے انکار بزدلی نہیں ہے۔ لیکن تم جس انداز سے
انکار کرتے ہو وہ انداز ہی سچائی کا سب سے بڑا دشمن ہے تمہیں اس طرح اپنے آئینوں کو
نہ کرنا چاہیے۔ اس سے سچائی مر جاتی ہے اور جھوٹ نئی طاقتوں کے ساتھ زندہ ہوتا
ہے۔ تم سچ کو زندہ رکھنے کی خاطر جھوٹ کے منہ پر کتوک کر گزریاں نہیں جاتے جرات
کی یہ کمی اہمیت کا یہ فقدان آدمی کو محرومیوں کے ان ڈھکے پھکے گوشوں میں چھوڑ آتا ہے
جہاں سے نکل آنے کا پھر راستہ نہیں ملتا۔“

”تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیے۔؟“

”تمہیں یہی کرنا چاہیے کہ تمہیں کچھ نہیں کرنا چاہیے۔“

”پھر۔“

”تم بہ بانگِ دہل کہہ دو کہ یہ اتنا بڑا نہ جھوٹ ہے کہ اس سے میرا کوئی علاوہ
ہو ہی نہیں سکتا۔ اور بڑے اعتماد سے اس دنیا کو نظر انداز کر کے قدم آگے بڑھا لو جو
تمہارے پیچھے جھج رہا ہے۔ تم پر کیمچر اچھا رہا ہے۔ تم جب اسے خاطر ہی میں نہیں
لاؤ گے تو جھوٹ اپنی موت مر جائے گا۔“

شکن در شکن

”میں کیا کرتا بھلا۔۔۔“

”میں نے قرآن سر پر اٹھا کر قسم کھالی کہ وہ بچہ میرا بیٹا ہے۔“

اتنا کہتے کہتے وہ آبدیدہ ہو گیا۔۔۔

آدمی زندگی بھر جھوٹ بولی سکتا ہے۔ لیکن آؤ کبھی چھوٹ نہیں بولی سکتے۔

مجھے داصف سے جبر روی لگتی۔ وہ اتنا بامردستہ اور اس قدر نرم آدمی تھا کہ اس پر لگائے ہوئے اتمام کو وہ اپنے سر بھی لے سکتا تھا۔ میں نے ایسا آدمی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔ آپ خنجر لے کر اس کے سینے پر سوار ہو جاسیے وہ آپ کی کلائی مرد کلائی خنجر آپ سے پھین لینے کی کبھی کوشش نہیں کرے گا۔ آپ سے التجا کرے گا کہ کھٹی جھجھوڑ دوسرے پھینا پھینا میں کہیں تمہارا لہو نہ زخمی نہ ہو جائے۔

وہ نہرے ہوئے گلے سے کہنے لگا: ”کیا تمہیں بھی میری بات کا یقین نہیں ہے۔“

میں نے اس کو تسلی دی۔ ”یار مجھے تمہاری بات کا اتنا ہی یقین ہے جتنا خود
تمہاری بھیسکی ہوئی آنکھوں کو ہے۔ لیکن۔“

”کہہ بھی چکو بھئی۔۔۔ یہ لیکن کیا ہے؟“

”لیکن۔۔۔ یہی کہ مجھے تمہاری یہ بزدلی پسند نہیں ہے۔“

وہ بکوں کی طرح رونے لگا۔

”تم اسے بزدلی کہتے ہو۔ جھوٹ سے انکار بزدلی ہے؟“

”میں نے کب کہا۔۔۔ جھوٹ سے انکار بزدلی نہیں ہے۔ لیکن تم جس انداز سے
انکار کرتے ہو وہ انداز ہی سچائی کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ تمہیں اس طرح اپنے آنسو خلع
نہ کرنا چاہیے۔ اس سے سچائی مر جاتی ہے اور جھوٹ نئی طاقتوں کے ساتھ زندہ ہوتا
ہے۔ تم سچ کو زندہ رکھنے کی خاطر جھوٹ کے منہ پر تھوک کر گزریوں نہیں جاتے۔ جرات
کی یہ کمی اہمیت کا یہ فقدان آدمی کو محرومیوں کے ان ڈھکے چھپے گوشوں میں چھوڑ آتا ہے
جہاں سے نکل آنے کا پھر راستہ نہیں ملتا۔“

”تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیے۔؟“

”تمہیں یہی کرنا چاہیے کہ تمہیں کچھ نہیں کرنا چاہیے۔“

”پھر۔“

”تم بہ بانگِ دہل کہہ دو کہ یہ اتنا مجرمانہ جھوٹ ہے کہ اس سے میرا کوئی علاقہ
ہو ہی نہیں سکتا۔ اور بڑے اعتماد سے اس دنیا کو نظر انداز کر کے قدم آگے بڑھا لو جو
تمہارے پیچھے جھج رہی ہے۔ تم پر کیچڑ اچھال رہی ہے۔ تم جب اسے خاطر ہی میں نہیں
لاؤ گے تو جھوٹ اپنی موت مر جائے گا۔“

دہ سگریٹ جلا کر کچھ اس طرح پنچی پنچی نظروں سے اپنے ابھرے ہونے سینے کو دیکھنے لگا۔ جیسے رازدوں کے اس خوانے سے سب سے قیمتی راز جن لینا چاہتا ہے جو اسے بے گناہ ثابت کر سکے۔

میں نے اسے پھر پھیرا۔ ”باپھوں میں دیا ہوا سگریٹ ایک حقیقت ہے تو اس کا دھواں تمہاری آنکھوں کو مسات نہیں کرے گا اس طرح گردن جھکائے کیا سوچ رہے ہو۔“

انگوں کی جگہ سگریٹ کے دھوئیں نے اب اس کی آنکھوں کو پانی سے پھلکا رکھا تھا۔ لمبا سا کش کر دہ کھٹے لگا۔

”یار دنیا عجیب ہے“

”ابہیت دو تو سب کچھ ہے، نہیں تو کچھ بھی نہیں“

”نہیں یار تم نہیں جانتے۔ اب دیکھو نا۔“

دہ کھتا کھتا رک گیا۔ چاروں طرف نظریں گھما کر اس طرح دیکھا جیسے میرے سوا اور بھی کوئی ٹھپ کر سں رہا ہو۔

”کوئی نہیں ہے۔ کہہ بھی چکواں۔“ میں نے ہمت بندھائی۔

”دہ بچہ اسی مرشد کا ہے جس کے ہم دونوں“

”تم دونوں جس کے مرید ہو۔“ میں نے جلدیے جینی سے پورا کر دیا۔

”ہاں“

”تمہیں یقین ہے۔“

”اتنا ہی جتنا یہاں تمہارے اور میرے وجود کا اس وقت یقین ہو سکتا ہے۔“

”پھر تم نے صاف صاف سب کے ہنڈ پر کہہ کیوں نہیں دیا؟“

”کیسے کہہ دوں یا ر۔“

”ایسے ہی جیسے اب مجھ سے کہاہے۔“

”تمہاری بات اور ہے۔“

”یہ سب بچو اس ہے۔“ میں برہم ہو گیا۔ ”تم میں اتنی جرات ہی نہیں ہے کہ تم روشنی کو روشنی کہہ سکو اور اندھیرے کو اندھیرا۔ اور یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ کچھ ہی دن پہلے اپنے اس مرشد میں جلوہ ہی جلوہ دیکھتے رہے ہو۔ نور کا نور۔“

”ایسا نہیں ہے۔“

”ایسا ہی ہے۔ تم شاید بھول رہے ہو کہ تمہیں نے مجھ سے کہا تھا کہ تم جب اپنے مرشد کے سامنے ہوتے ہو تو ایسا محسوس کرتے ہو کہ جیسے کسی طاقت نے، کسی عظیم سچائی نے، کسی روشنی نے۔ تمہیں اپنے احاطے میں محصور اور محفوظ کر لیا ہے۔“

”اور تم اس بات کی ہنسی اڑاتے رہے ہو۔“

”اور تم آج ہنسی اڑانے کی طاقت سے بھی محروم ہو گئے ہو۔“ میں نے پھر

درا کیا۔

”لیکن وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔“

”تم آج بھی یہی سمجھتے ہو۔“

”آج بھی میرا جی چاہتا ہے کہ میں یہی سمجھوں۔“

”تم پاگل ہو گئے ہو، تم جیسے آدمی کے پیچھے اپنی تو انا نریاں صرت کرنا بجائے

خود بے وقوفی ہے۔“

وہ کچھ دیر درو دیوار کو تختہ رہا۔ ایسی نظروں سے جیسے درو دیوار اس کو تنگ
 رہے ہوں اور وہ خائف خائف سا کھنٹس بس دیکھ رہا ہو۔ دیکھے جہاں رہا ہو۔

جب جنون کا یہ عالم ہے تو جھوٹ موٹا ہی کہہ دو کہ بچہ میرا ہے۔ نہ تھا یہی
 محبوبہ کی رسوائی ہوگی نہ ہی تمھارے مرشد کی عظمت میں کوئی فرق پڑے گا۔
 لیکن اس نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا۔

”اچھا اب چلتے ہیں“ وہ یکا یک کھڑکھڑا ہوا۔
 میں نے بھی روکنے کی کوشش نہیں کی۔

چلتے ہوئے کہنے لگا۔ ”کچھ روپے مجھے قرض دے سکتے ہو؟“

اس نے اپنی دوستی کی اتنی طویل مدت میں پہلی بار مجھ سے قرض مانگا تھا۔ میرا
 عالم یہ تھا جیسے میں کہیں کا نہیں رہا ہوں۔ جیسے زمانے بھرنے اپنے پیروں تلے مجھے روند کر کھینک
 دیا ہے۔ میری جیب اس طرح خالی تھی جیسے اس کے قرض مانگنے پر میرا دماغ خالی
 خالی سا ہو گیا تھا۔ میں نظریں نیچی کے چپ چاپ سکتے کے عالم میں کھڑا رہا۔
 ”میں ضرور لوٹا دوں گا یا رہے“

میرے پس و پیش پر اس نے مجھے غلط سمجھا۔

میں نے چپکے سے اپنی سوتے کی جڑاوی انگوٹھی اتار کر اس کی انگلی میں پہنا دی
 جو چھ آٹھ ماہ قبل میری ہونے والی دلہن کے والدین نے میری ”منگنی“ طے ہونے پر مجھے
 تحفے میں دی تھی۔

”یہ کیا کرتے ہو؟“

”میرے پاس یقیناً مانو اس وقت کچھ بھی نہیں۔ تم اسے کہیں گر دیں رکھا کر

کام نکال لو۔ پیسے آنے پر پھر اگر مجھے لوٹا دینا۔“
 وہ انکو کھٹی جیب میں ڈال کر تیزی سے نکل گیا۔ شاید وہ پھر دور رہا تھا۔
 وہ جا چکا تو میں دیر تک اسی کے متعلق سوچتا رہا۔

اس سے ملنے کے بعد میرے ذہن میں اکثر سوئے ہوئے نئے سراٹھاتے۔ وہ نئے جن کا تعلق اس کی اپنی ذات سے تھا۔ اس کی اپنی محبتوں سے تھا۔ اس کی اپنی ہنگامہ پر دوا و رشد و عشق بازی سے تھا اور ان کی چھوٹی بڑی داستاؤں سے تھا۔ ان داستاؤں سے جو اس کی نوٹ بک کے صفحات میں اختصار کے طور پر حروف تہجی کی صورت میں محفوظ تھیں۔

اسے ۳۱ جنوری ۱۹۴۷ء تا ۲۱ جون ۱۹۴۹ء — اب یہ الف۔ انوری بھی ہو سکتی ہے۔ آنہ بھی یا کوئی اور۔

”ت“ سے ۲۲ جون ۱۹۴۹ء تا ۲۱ جنوری ۱۹۵۱ء — اس حد تک مجھے معلوم تھا کہ یہ کوئی تہنیت تھی۔ جو واصف کے لیے آئیوڈین پی لینے کی کوشش میں پکڑی گئی تھی۔ اور بعد میں کسی ضلع میں کسی پٹری بیوپاری سے بیاہی گئی۔

”ج“ سے ۱۶ مارچ ۱۹۵۱ء تا ۱۱ مارچ ۱۹۵۱ء — یہ بھی مجھے یاد ہے۔ یہ جمیلہ تھی۔ یو۔ پی کے کسی ضلع سے کچھ دن کے لیے اپنے شوہر کے ساتھ حد آباد آئی ہوئی تھی اس لیے کہ یہاں اس کے شوہر کے کچھ رشتہ دار تھے جب اس کے شوہر کو کچھ شبہ ہوا تو خود جمیلہ نے واصف کے خلاف اس کے کان بھروسے۔ پھر ایک رات کو جمیلہ کے شوہر نے واصف کا گریبان پکڑ لیا جس کا نتیجہ ہوا کہ وہ اس کا کمرہ آٹھ دس دن تک مقفل رہا۔ اس کے ملنے جلنے والوں میں یہ بات مشہور ہوئی

کہ وہ اپنے گھر گیا ہے لیکن میں ہاسپٹل میں اس سے ملتا رہا۔

یہ عشق و محبت کی داستانیں الف سے لے کر دالسلام تک اس کی نوٹ بک میں بکھری پڑی تھیں۔ جو آج اس کے چلے جانے کے بعد مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ بچہ داصف کا نہیں ہے۔ بچہ داصف کا ہو ہی نہیں سکتا۔

مجھے ان چلاتی ہوئی داستانوں کی چیخ و پکار کو غلط سمجھنے کا کوئی حق ہی نہیں تھا۔ اس لیے کہ میں جانتا تھا کہ داصف کی پیاس، داصف کی تشنگی، پہلے پہل اس کی خود بینی اور پھر اس کا مقدر بن گئی۔

اس نے پھوٹے بڑے کٹی عشق کیے۔ اتنے شدید عشق بھی کیے کہ اس کا پاگل ہو جانا یقینی تھا لیکن وہ کبھی پاگل نہیں ہوا۔ نہایت احتیاط سے مجرمیوں اور ناکامیوں کے درمیان لٹکتا رہ گیا۔ انجام کو جانے بغیر اس نے ہر محبت کی ناکامی پر دوسری محبت کی بنیاد رکھ دی۔

”س“ سے اس نے بے اندازہ، بے پناہ اور طویل المیعاد محبت کی۔ اس محبت میں شاید وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہوا۔ لیکن اس محبت اور فتح نے اس کی رگ دپے میں نہ ہر کے وہ نشتر توڑ کر رکھ دیے جن کی کھٹک اور کسک اس کی زندگی کا حاصل ہو کر رہ گئی۔ اس کا نام غالباً سرور جہاں تھا۔ جس نے داصف کو مرد کی طرح عورت کے قریب آنے کا حوصلہ دیا۔ پندار عطا کیا۔ لیکن اس کے بدلے اس نے گھر بھر کی دولت سمیٹ لی۔ اس کا نام نہاد عشق کے ہاتھوں داصف جیل جاتے جاتے بچا۔ اس نے ایک جوہری کو دھوکا دے کر زیور حاصل کیے اور جب نافوس نے اس کو اپنے شکنجے میں کس لیا تو اس کی ایک متمول رشتہ دار نے اس کو اس مصیبت سے نجات

دلالتی۔

مجھے یاد ہے ان دنوں داصف کا عجیب عالم تھا۔ اس کو جیسے سب کچھ حاصل تھا لیکن کچھ بھی حاصل نہ تھا۔ سرور کی ہر چھوٹی بڑی خواہش کی تکمیل اس کی سب سے بڑی خوشی تھی۔ اور اس خوشی کے حصول میں اس نے اپنی قریب ترین ہستیوں کو ذہنی اور قلبی اذیت پہنچانے سے بھی گریز نہیں کیا تھا۔ اس کو بس ہمیشہ یہی فکر دامن گیر ہوتی کہ سرور کو کوئی ایسی نرالی چیز تحفے میں پیش کی جائے کہ وہ مارے خوشی کے پھولی نہ سلے۔ اور ان تحفوں کے سہارے اس کی محبت پر دان چڑھے۔ اور اس طرح وہ اپنے اس حسنی کارڈ بار کو محبت کا لفظ دے کر خود قریبی میں مبتلا ہو جاتا۔

ان دنوں وہ جب بھی مجھ سے ملتا کچھ ایسا محسوس ہوتا جیسے اس نے کوئی ایسا چیز اپنا زندگی سے کھو دی ہے جو سب سے زیادہ اہم تھی لیکن وہ کیا چیز تھی یہ خود داصف کو بھی یاد نہیں رہا تھا۔

وہ باتیں کرتا کرتا نکالیا کہ اس طرح اٹھ کھڑا ہوتا جیسے اسے یقین ہو گیا ہو کہ اب اس مقام پر اس کا ایک منٹ کا قیام بھی اس کی زندگی کی ساری پونجی اس سے چھین لے گا۔ وہ کہتا: ”یار۔ والہانہ عشت کرتی ہے مجھ سے۔ ایک بل مجھ سے جہا نہیں رہ سکتی۔“ مجھ داصف کی اس دیدہ دلیری پر ہنسی آجاتی مجھے محسوس ہوتا کہ داصف بڑی سفاکی سے جھوٹ بول رہا ہے۔ ایک ایسا جھوٹ جو ہر جذبے کا قاتل ہو۔ ایک ایسا جھوٹ جس کے ہاتھوں خلوص مرتا ہے تو بھر زندہ نہیں ہونے پاتا۔ اور اس کے بعد صرف COM PLEX آدمی کے ساتھ رہ جاتا ہے اور کچھ نہیں رہتا۔

مجھے معلوم تھا کہ داصف اتنا معصوم آدمی نہیں ہے جو سرور جہاں کے والہانہ عشت

اور ہوس کے درمیان خطا فاصل نہ کھینچ سکے وہ سب کچھ جانتا تھا لیکن دھوکا دینے اور دھوکا کھانے میں اس کو جو لذت ملتی تھی وہی شاید اس کی دانست میں اس کا سب سے بڑا وصف تھا۔ اس طرح جب اس نے اپنا سب کچھ لٹا دیا تو بارے ہوئے جواری کی طرح آخری داؤ لگا کر مطمئن ہو رہا۔ اس لیے کہ اس کا یہ داؤ چل گیا تھا۔ اور وہ سب کچھ بار کر بھی اس فتح و نصرت پر قانع تھا۔

مجھے معلوم ہوا کہ اس نے اپنے ایک بہت ہی کھاتے پیتے دوست کو جو ایک اونچے خاندان کا چشمہ و چراغ تھا۔ سردار کی محبت میں مبتلا کر دیا ہے۔ اب اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی یہی ہے کہ سردار جہاں کی ہر خواہش کو اپنے دوست کے ہاتھوں مکمل ہوتا ہوا دیکھے۔

میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا کہ واضح ہے جو راستے اپنے لیے متعین کیے ہیں وہ اس کو ایسی ایسی اندھیوں کی گھاٹیوں میں لے جاسکتے ہیں جہاں نہ صرف ہاتھ کو ہاتھ سمجھائی نہیں دیتا بلکہ خود اپنے وجود اور عدم وجود کے احساس ہی میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا۔ لیکن وہ ان دونوں مجھ سے نہیں ملا۔ اور نہ ہی میں نے اس سے ملنے کی اذیت برداشت کرنے کی کوشش کی۔

ایک رات وہ یکا یک آدھمکا۔ بہت سرد رہا۔ بہت خوش۔ میں نے کچھ نہ جاننے کے انداز میں پوچھا ”س“ سے تمہارا عشق کس منزلی میں ہے۔ اس نے قہقہہ لگایا۔ ”یار کیا آؤٹ آف ڈیٹ آدمی ہے۔“

میں نے دانستہ حیرت کا اظہار کیا۔ ”کیا بات ہے، میں نہیں سمجھ سکا۔“
 ”بھئی س سے الگ ہوئے زمانے بیت گئے۔“

”اور تم ابھی تک زندہ ہو۔“

”ہوں۔ دیکھو بالکل ہوں۔ تمہارے سامنے ہوں۔“

اس نے میرے طنز کے سہ پر اس طرح تھوک دیا جیسے کوئی بات ہی نہیں بولی۔

”آخر کس موٹر پر رہ گئی بے چاری۔“

”موٹر پر نہیں منزل تک پہنچا آیا ہوں۔“

”تو گویا اس کی منزل اور تمہاری منزل جدا تھی۔“

”یس ہی سمجھو، سمجھتا تو یہی تھا کہ منزل دونوں کی ایک ہی ہے لیکن ایسا نہ ہو سکا

میں تو آگے نکل آیا ہوں۔“

”تو اب کہاں تک جاؤ گے۔“

”بس دیکھتے رہو۔“

”کسی نئی منزل کی تلاش ہے یا صرف چلتے رہنا ہی“ مقصد زندگی ہے؟۔“

”تلاش نہیں منزل متعین ہے۔ اسی کی جانب نگران ہوں اور قدم اٹھا

رہا ہوں۔“

میں نے نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔

باتوں کا یہ سلسلہ ویر تک چلتا رہا۔ پھر اس نے بتایا کہ اس نے بیچ وقت نماز

شروع کر دی ہے عشق کی ساری نئی پرانی داستانوں کا دفتر پارینہ جلا کر بھینک دیا

ہے۔ شہر کے کسی نامی پیر و مرشد کا مرید خاص ہو گیا ہے۔

میں نے اس تبدیلی کا مذاق اڑانا مناسب نہ سمجھا۔ وہ پھر اس طرح شروع و ختم

ہے اپنے مرشد کا تذکرہ کر رہا تھا کہ اس کے اس اعتماد کو منزل کوئی نہ مانجھے گا اور نہ ہی۔

پھر وہ چلا گیا اور پھر ہی دن بس ایک دن مجھ سے رستے میں اس کی مٹھ بھیر ہو گئی۔
 میرے بچنے پر اس نے بتایا کہ وہ مکہ مسجد سے نماز جمعہ ادا کر کے چلا آ رہا ہے۔
 مجھے پتہ نہیں اس کے گھر پر آج پھر وہ بشت کیوں نظر نہ آئی جو کچھ ہی دن قبل
 میں نے دیکھی تھی۔

”کیوں محنت تو ٹھیک ہے نا؟“

”ہاں“ اس نے اس انداز سے کہا جیسے میرا سوال ہی محل تھا۔
 پھر خود ہی کہنے لگا۔ ”یار میں تمہارے پاس آنے ہی والا تھا“
 میں نے پوچھا۔ ”کیوں خیر تو ہے۔ کچھ کسی جگہ میں تو نہیں پڑ گئے؟“
 ”نہیں یار یوں است کہو۔ تم بعض وقت بڑا امانت آیتہ انداز اختیار کرتے ہو“
 میں نے اس قسم کی بات اس کی زبان سے پہلی بار سنی تھی محبت کے تعلق سے اس قسم کا
 اظہار خیال اس کی شخصیت کا ایک بالکل نیا پہلو تھا جو شاید اس پیری مریدی کا عطیہ ہو۔
 میں نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔

”اچھا بھئی معاف کر دو۔ لیکن بتاؤ تو بات کیسا ہے؟“
 اس نے پھر اس انداز سے کہا جیسے کسی آیت کا ترجمہ کر رہا ہو۔
 ”مجھے اپنی ایک پیر بہن سے انس ہو گیا ہے“
 ”اور یہ انس بہت جلد محبت تک جا پہنچے گا۔“
 ”نہیں یار تم ہمیشہ کی طرح مذاق نہ اڑاؤ؟“
 ”حقیقت کا اظہار مذاق تو نہیں ہوتا“
 ”لیکن حقیقت کا انداز اظہار اتنا تلخ بھی تو نہیں ہونا چاہیے۔“

بچوں کہ ہمارے راستے مختلف تھے اس لیے ہم جدا ہو گئے۔ اور بات اس سے آگے نہ ہو سکی۔ ویسے میں نے اس کو رد کرنا بھی چاہا۔ لیکن وہ خود بڑی جلدی میں تھا۔ اس کے بعد دو ایک بار مجھ سے ملا تو مجھے معلوم ہوا کہ اپنی پیر بہن سے اس کا معاشرہ بڑی شدت اختیار کر گیا ہے۔ وہ بڑی پاک اور بے عیب محبت کر رہا ہے۔ ایسی محبت جو ٹھنڈا سایہ تو چاہتی ہے گھنا نہیں چاہتی۔ ایسی محبت جو نشہ تو چاہتی ہے دھندل نہیں چاہتی۔ ایسی محبت جو روح تو چاہتی ہے جسم نہیں چاہتی۔ میں بھلا اس سے کس طرح کہتا کہ اس کی شخصیت کی یہ نئی پنا گاہیں اسے راس آئیں۔ ایک بار یہی باتیں کرتے کرتے اس نے اپنی تھیلی میری طرف بڑھا دی۔ ”دیکھتے ہو؟“ میں نے کہا۔ ”نہیں میں پامسٹ نہیں ہوں۔“ لیکن اندھے بھی تو نہیں ہو؟“

”ادہ۔۔۔“ میری نظر تھیلی کے پچوں پہنچ اس داغ پر جم کر رہ گئی جو وہ مجھے دکھانا چاہتا تھا۔

”یہ جو داغ ہے نا اس میں مجھے چاند کی ٹھنڈی روشنی نظر آتی ہے۔ اور یہی روشنی اب میرا مقدر ہے۔“

”یار، میں تو رہتا تھا، نماز پڑھنے سے پیشانی پر سجدوں کے نشان ابھرتے ہیں لیکن تم نے تو تھیلی پر بہشت بنا دی۔“

وہ کچھ برہم ہو گیا۔ ”تمہیں اپنا یہ پرانا طور طریقہ چھوڑ دینا چاہیے۔“ میں نے اس کو سنا لیا۔ ”اچھا بھئی۔“ اب جو کبھی ایسی گت اخی کی تو دہی سزا دینا جو کبھی سچ کے شوہر نے تمہیں دی تھی۔“

وہ بے اختیار سہنس پڑا۔ ”یار باز بھی آؤ اپنی شرابہ توں سے“
 میں نے اس کو بھینچ لیا۔ ”اچھا اب بتا بھی دو کہ آخر یہ نشان کسے کیا؟“
 اس نے مجھے بتایا کہ اپنی پیر بہن کے انکار پر اس کا دل جیتنے کے لیے اس نے
 اپنا پہلا نامہ محبت جو اس کی پیر بہن نے اس کو سخت سست کہہ کر لوٹا دیا تھا
 اپنی ہتھیلی پر رکھ کر اس کے سامنے ہی آگ لگا لی تھی کہ اس کے ہاں کہہ دیئے تک
 وہ اسی طرح اپنی ہتھیلی کو جلاتا رہے گا۔ اور اس کی پیر بہن نے بے قرار و
 مضطرب ہو کر حامی بھر لی تھی۔ اور اس طرح ہتھیلی کا یہ داغ اس کی بے دارغ وخت
 کا جھلکا تا نشان بن گیا تھا۔

اس کے بعد پھر وہ بہت دنوں تک مجھ سے نہیں ملا تھا۔
 اور جب آج ملا تھا تو اس نے مجھے بتایا تھا کہ قرآن سر پر اٹھا کر اس نے
 قسم کھالی ہے کہ وہ بچہ اس کا نہیں ہے۔
 اور اس کا گلہ نہ دھا ہوا تھا۔

اور میں سوچ رہا تھا کہ۔۔ آدمی زندگی بھر جھوٹ بول سکتا ہے۔ لیکن
 آنسو بھی جھوٹ نہیں بول سکتے۔

پھر جب وہ انگوٹھی لے کر جارا ہوا تھا تب بھی میں نے محسوس کیا تھا کہ شاید وہ دردموہ
 اس کے بعد پھر وہ بہت عرصے تک مجھ سے نہیں ملا۔

اس سے بالکل غیر متوقع طور پر میری ملاقات اپنے ایک دوست کے کسی
 قریبی رشتہ دار کی شادی میں ہوئی۔

وہ بے حد مصروف تھا۔ شادی کے انتظامات اس قدر تن دہی سے کر رہا تھا کہ

دافنی اس کو منٹ بھر کی بھی فرصت نہ تھی۔

میں دور بیٹھا ہوا اس کو دیکھ رہا تھا۔ اپنے دوست سے جس نے مجھے مدعو کیا تھا۔ استفار پر مجھے معلوم ہوا کہ دامن انھیں پیر دمر شر کی صاحبزادی ہیں جن کے ہاتھ پیر داصف نے بیعت کی تھی۔

داصف کی مصروفیت کا سبب روز روشن کی طرح میرے سامنے واضح اور عیاں تھا۔ وہ ایک گوشے میں کھڑا ہوا، انتظامی امور کے تعلق سے پہلیات دے رہا تھا۔ میں اٹھ کر اس کے قریب پہنچا تو اس نے مجھے دیکھا اور اس طرح بالکل اتفاقی ملاقات کی سہرت میں مجھ سے معافہ کیا۔

میں اس کے پاس ہی کھڑا ہو گیا اور سگریٹ جلا کر باتوں کا سلسلہ شروع ہی کرنے والا تھا کہ ایک چھوٹی ٹیسی لڑکی جلدی سے آکر ایک لفافہ اس کے ہاتھ میں تھما گئی۔ اس نے بڑے اطمینان سے لفافہ چاک کیا۔ گلابی رنگ کا ایک کاغذ نکال کر بڑے اہتمام سے پڑھنے لگا۔

میرا جسم خواہ کسی کی ملکیت ہو، میری روح ہمیشہ
کے لیے آپ کی رہے گی۔ یہ انگوٹھی آج تک آپ کی
نشانی کے طور پر میرے دل کے ساتھ رہی۔ اب اس کو
آپ میری نشانی سمجھ کر اپنی انگشت شہادت کی زینت
بنائے رکھیے۔

خیر تک آپ کی

”بڑی صاحبزادی“

اس نے جب ٹھنڈی آہ بھر کر انگوٹھی نکالی تو میں پہلی نظر ہی میں پہچان گیا کہ یہ وہی انگوٹھی ہے جو نہ صرف میری اپنی ملکیت ہے بلکہ میری سنگیت کی نشانی ہونے کے ناطے سے میرا جذباتی لگاؤ بھی جس سے وابستہ ہے۔ لیکن اس وقت میں نے اس طرح نظریں پھیر لیں جیسے انگوٹھی کو میں نے دیکھا ہی نہیں۔

د اصف خود تجھ سے مخاطب ہوا۔ ”پہچانتے ہو اس انگوٹھی کو؟“
میں بس دیکھتا ہی رہ گیا کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ وہ پھر خود ہی کہنے لگا۔
”یار، ابھی رہنے دو میرے پاس، دو ایک دن میں لوٹا دوں گا۔“
خط اپنی جیب میں رکھتے ہوئے اس نے بڑے فخر سے مجھ سے پوچھا ”جانتے ہو۔ یہ خط کس کا ہے؟“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔
کہنے لگا۔ ”پیر دشت کی بڑی صاحبزادی کا۔“
”آج انھیں کی تو غالباً شادی ہے۔“ میں نے مکرر تصدیق چاہی۔
”ہاں بھئی۔۔۔ دہن بن گئی ہیں لیکن مجھے بھولنے میں اب تک کامیاب نہ ہو سکیں۔ تم نے تو اپنی انکھوں سے خط دیکھ لیا نا۔“
پھر وہ مختلف لوگوں کو کچھ ہدایات دینے لگا۔

میں آہستہ سے اس کے پاس سے کھسک آیا۔ پتہ نہیں کیوں مجھے اس کے ساتھ اب ایک لمحہ گزارنے کے خیال سے بھی وحشت سی ہو رہی تھی۔
شادی سے لوٹنے لگا تب بھی اس سے ملاقات نہ ہوئی۔ وہ کسی کام سے اندر زنان خانے میں چلا گیا تھا۔

پھر دقت کا ایک لمبا دریا اس کے اور میرے درمیان حائل ہو گیا۔
وہ اب میری طرف بالکل نہ آتا تھا۔

میں نے اپنی شادی میں بذریعہ رجسٹری بطور خاص اس کو رقعہ بھیجا۔
وہ پھر بھی نہ آیا۔

اپنی رنگارنگ نئی زندگی کے سبھانے اور سنوارنے میں، میں پھر کچھ اس
طرح لگا کہ اسے بھول بھال گیا۔

ایک دن راستے پر مجھے کسی جانی پہچانی آواز نے مخاطب کیا۔ میں نے
ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ کوئی نہ تھا۔ آگے بڑھنے لگا تو بالکل برابر سے کسی
نے میری بانہ بکڑ لی۔

”ادھ باتم ہو، یہ میں ریش دبردوت“

میں بدقت تمام اس کے اس حلیے کو پہچان سکا۔

داڑھی میں اس کا چہرہ کچھ دقیقہ ضرور ہو گیا تھا۔

اس نے کہا: ”اب میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔ چلو، تمہیں تمہاری بھابی

سے ملاؤں“

میں نے شکایت کی۔ ”شرم آئی چلے۔ الگ الگ شادی کرنی پڑے۔“

تک نہ کیا۔ اور پھر میری شادی میں بھی نہیں آئے۔“

اس نے معافی چاہی۔ کہنے لگا: ”کیا بتاؤں کیسے کیسے انقلابات زندگی

میں آئے ہیں۔“

میں نے کہا: ”وہ تو تمہارے چہرے سے ہی ظاہر ہیں۔“

”دہ مجھے گھسیٹنے لگا۔“ چلو بھئی۔“

”بھئی آخر رہتے کہاں ہو۔“

”یہیں۔۔۔ سانسے، اسی ڈیوڑھی میں۔“

”کیا یہ سسرال ہے بھاری؟“

”سسرال نہیں۔ میرا اپنا گھر سمجھو۔ یہ بات دراصل یہ ہے کہ۔۔۔ تمہیں

سن تو یاد ہے نا۔“

”ہاں ہاں ابھی طرح یاد ہے۔“

یہ اسی کے میاں کی ڈیوڑھی ہے۔ بس یہیں میں بھی اپنی بیوی سمیت رہتا ہوں۔ دوست ہویا تو ایسا ہوں۔ ایک پل میرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا کیا نفیس آدمی ہے۔ سرتابہ قدم محبت ہی محبت۔ اس سے زیادہ میری اپنی حکومت اس گھر پر چلتی ہے۔ سن بھی مطمئن ہے اس کا شوہر بھی۔ مجھے بھی ہر طرح کا اطمینان حاصل ہے۔ بس اپنی کتب زیر مطالعہ رہتی ہیں۔ اس کے سوا مجھے کوئی کام نہیں۔ یہی لوگ میرے کفیل ہوتے ہیں۔ بڑا خدارسیہ آدمی ہے۔ ایک سانس میں اس نے اتنی ساری باتیں کہہ دیں۔

باتیں کہتے کرتے ہم ڈیوڑھی میں داخل ہو گئے۔ زنانہ دروازے پر پہنچ کر میں رک گیا۔ تو اس نے پھر بانہہ پکڑ کر مجھے کھینچا۔ ”چلے آؤ بھئی۔ تم سے جھلا کون پردہ کرے گا یہاں۔“

صحن سے ہو کر دیوان خانے میں پہنچے تو بیٹھے ہوئے لوگ ایتادہ ہو گئے۔ ”ان سے ملو یہ میرے کرم فرما۔ میرے جگر کی دوست، میرے محسن،

یہ ان کی بیوی — اور یہ میری بیوی — پیر و مرشد کی چھوٹی صاحبزادی ہیں۔ حضرت نے مجھے فرزندگی میں قبول فرمایا ہے۔“
 و اصف کی بیوی نے سلام کیا تو اس کی انگلی میں انگوٹھی جکڑ رہی تھی۔
 میں نے انگوٹھی سے پھر نظر میں پھیر لیں۔

میں لوٹنے لگا تو گیٹ کے باہر تک وہ مجھے چھوڑنے آیا۔ میں نے
 کہا ”یار تمھاری اس پیر بہن کا کیا ہوا۔ تم نے پھر کبھی کچھ بتایا ہی نہیں۔“
 وہ کچھ بوکھلا سا گیا۔

بات بدل کر اس نے کہا۔

”س کے متعلق تمھارا کیا خیال ہے۔ ہے نا، ہرگز ایمان و آگاہی“
 سرگوشی کرنے کے انداز میں جھک کر مجھ سے کہنے لگا۔ ”اب بھی کبھی کبھی

ملفت ہو جاتی ہے۔“

”اف“ میں جیسے گرتا گرتا سنبھل گیا۔ جب ہوش بجا ہوئے۔

تو میں نے پھر پیر بہن کا تذکرہ چھیڑا اور انداز سے برگولی چلا دی جو
 ٹھیک اس کے سینے پر لگی۔

”شر ماؤ نہیں یار مجھے سب معلوم ہو چکا ہے۔“

”پھر کیا تم یہ چاہتے ہو کہ مکرر اپنے جرم کا اقبال مجھ سے کروائیں۔“

”نہیں بھئی۔ میں نے تو بس یو نہی تم سے پوچھا تھا۔“

”کیا بتاؤں یار۔ میں اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرنے سے اپنے

عقد میں لینا چاہتا تھا۔“

”پھر کر کیوں نہیں لیتے عقد“

”یارِ قم بھی عجیب آرٹ آف ڈیٹ آدمی ہو۔ اس نے تو انہیں دلوں
خودکشی کر لی۔ لیکن میں اب بھی ہر جمعہ کو اس کے نام پر ختم قرآن کرتا ہوں۔“
مجھے ایسا معلوم ہوا کہ داحض اپنی پسر بہن کی قبر پر بیٹھا اسی قرآن کا ورد
کر کے اس کے نام پر بخش رہا ہے جس قرآن کو سر پر نہ رکھ کر اس نے کبھی
قسم کھائی تھی کہ وہ بچہ اس کا نہیں ہے۔

چور

میں اس لیے ادا اس نہیں ہوں کہ شہر کی وہ جانی پہچانی سڑکیں، وہ مانوس گلیاں جو دن کو اپنے اجالوں اور شب کو اپنے اندھیروں سمیت میرے قدموں کے نیچے بکھی رہتی تھیں اب میرے قدموں کی چاپ کو ترسیں گی ان کے لمس کو ترسیں گی۔

میں اس لیے ادا اس نہیں ہوں کہ میرے وہ ساتھی جن کے قدم بہ قدم میں نے زندگی کی جدوجہد میں حصہ لیا ہے اب میرے اپانچ ہو جانے کے باعث مجھے چھوڑ کر آگے نکل جائیں گے۔

میں اس لیے ادا اس نہیں ہوں کہ اس حادثے نے میری ساری ہستی کو اٹھل پھل کر کے رکھ دیا ہے۔ میرے ماضی کی مضبوط جڑیں میرے حال کی سنگلاخ زمین کے کھر درے سینے میں بے طرح ہل کر رہ گئی ہیں اور اب

میرے مستقبل کی چمکدار دھرتی پر ان کے بارے میں پانے کی کوئی سبیل نہیں ہے۔
 میں اس لیے ادا اس نہیں ہوں کہ مجھے ڈاکٹر دُن نے ابھی نہیں بتایا کہ میرے
 بیدار ذہن کی جلتی ہوئی نو بجھ نہیں جائے گی، میری عمیق آنکھوں کی شریر
 کہیں سرد نہیں پڑ جائیں گی۔ میرا تارِ نفس، میری زندگی کا رشتہ، اسید
 ٹوٹ نہیں جائے گا۔

میں اس لیے بھی ادا اس نہیں ہوں کہ تم اب بھی نہیں آئی ہو۔ مجھے علم ہے
 کہ جو جدائی تمھارا اور میرا قرار ہے اس کے ناطے میں اب ان راستوں کا
 تصور ہی نہ کروں جن راستوں پر چل کر تم میری پہونچنا سے بہت دور نکل گئی ہو
 اور میں جن راستوں پر آگے بڑھ رہا تھا ان کی سمت اتنی مختلف تھی کہ میرا ہر قدم
 تم سے مجھے اور دور اور دور کر رہا تھا۔

تمھارا ذکر اب میری زندگی سے صحت اس قدر وابستہ ہے جیسے بے آب
 گیاہ جنگل میں، کھڑی دوپہر کے وقت، بے برگ دیوار پیڑ کے نیچے کسی ٹھکے ماند
 پیلے سا فرکا وجود۔ جو بھری بہاروں کا تصور کیے بیٹھا ہو۔

لیکن اس کے باوجود۔ تمھارا ذکر پھر تمھارا ذکر ہے۔ اور میری زندگی
 اب میری زندگی نہیں۔

پھر اب میرے پاس اس اداسی کا سبب رہ ہی گیا جاتا ہے۔ لیکن
 اس کے باوجود میں ادا اس ہوں۔

بڑنمبر پر میں نے جب آنکھ کھولی ہے تو مجھے علم نہیں ہوا کہ میری آنکھیں کھلی ہوئی ہیں۔
 بڑنمبر پر جب میں نے اپنی آنکھیں دیر تک کھلی رکھنے کے بعد بند کر لی ہیں اس وقت

مجھے اس احساس ہوا جیسے میری آنکھیں کھلی ہوئی ہیں۔ اور میں سب کچھ دیکھ رہا ہوں۔
دوڑتا ہوا موٹر، ٹکراتا ہوا سائیکل جس پر میں سوار ہوں۔ دوڑتا ہوا
موٹر، ٹکراتا ہوا سیکل۔ دوڑتا ہوا موٹر، ٹکراتا ہوا سیکل۔

اور جب مجھے موت کی گہری کھانی سے زندگی کے پیرنگ کر لیا ہے تو میں بہت
ہی سہما سہما زندگی کے پیچھے پیچھے پیر دبا کر، سنبھل سنبھل کر بڑی ہی احتیاط سے
چل رہا ہوں کہ مبادا اس کو میری کوئی حرکت ناگوار گذرے اور وہ قدم
بڑھا کر آگے نکل جائے اور میں لپک کر اس کا دامن بھی نہ تھام سکوں۔

میری صرف پلکیں ہل رہی ہیں۔ میں صرف آنکھیں جھپک رہا ہوں۔ اجالے
اور اندھیرے آپس میں مدغم ہو رہے ہیں۔ پھر جدا ہو رہے ہیں۔ میں سمجھی
آنکھیں پہچان رہا ہوں، کبھی نہیں پہچان رہا۔ یہ اجالا ہے۔ یہ اندھیرا ہے۔
یہ اجالا اور اندھیرا دونوں آپس میں مل گئے ہیں۔ پتہ نہیں یہ کیا ہے۔ وہ
کیا ہے۔

اب، جب کبھی میں اجالے کو پہچان لیتا ہوں، دباؤ ایک چہرہ بھی مجھے دکھائی
دیتا ہے۔

میری صرف پلکیں ہل رہی ہیں۔ میں صرف آنکھیں جھپک رہا ہوں۔
اب اجالے ہی اجالے میرے اطراف پھیل گئے ہیں۔

اب نہ ان اجالوں کو میں جھٹلا سکتا ہوں۔ نہ اس چہرے کو جو اندھیرے
میں ڈوب ڈوب کر ابھرتا ہے۔

”آپ نے پہچانا مجھے؟“

بالآخر اس کو میں نے پہچان لیا۔ وہ بھی صرف اس حد تک کہ اس کا چہرہ میرے لیے نامانوس نہیں ہے۔ وہ مریضوں کا یونی فارم پہنے ہوئے تھا۔ پھر اس نے اپنے تعلق سے مجھے بہت کچھ بتایا۔

کبھی وہ اور میں ایک ہی اسٹیشن پر آسنے سامنے کی بنیوں پر کئی رات سو چکے تھے اجالوں کے ساتھ ہم ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے تھے، اندھیروں کے ساتھ ہم ایک دوسرے کے مقابل اپنی پہنچ سنبھال لیتے تھے میں نے کبھی اس سے قرب کی کوشش نہیں کی۔ اس نے کبھی مجھے لائق اعتناء نہیں سمجھا۔

پھر ہم ایک دوسرے سے اس طرح جدا ہو گئے جیسے کوئی راہ گیر سگریٹ جلانے کے لیے دوسرے راہ گیر کا ایک تیلی کا احسان اٹھا کر محبوب محبوب جدا ہو جاتا ہے۔

مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ کس نے کس سے تیلی مانگی تھی اور کون کس کا محسن ہے۔ وہ دن میں کتنے ہی بار اپنے بستر سے میرے پلنگ تک آتا رہا۔ مجھ سے کتنی ہی باتیں کیں مجھے قلبیاں دیں۔ میرے تعلق سے جھوٹ موٹ ہی اکسرنے سیکشن کی امید افزا رپورٹ کا ذکر کیا۔ میرے جلتے ہوئے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ میری پسینے سے تریشانی سے چھٹے ہوئے بال درست کیے۔

اس کے باوجود میری آنکھیں اس کے چہرے سے ہٹ کر کچھ تلاش کرتی رہیں۔ میں نے اس سے پوچھا: یہاں ملنے والوں کی آمد کا وقت کب ختم ہوتا ہے۔ میں نے جس وقت اس سے یہ سوال کیا ہے اس وقت مجھے معلوم تھا کہ وہ کیا جواب دے گا۔ لیکن میرا دل موس رہا تھا ایک ایسا غم آہستہ آہستہ میرے

وجود پر قبضہ کر رہا تھا جس غم کا میں کوئی نام نہیں دے سکتا تھا۔ میرے وارڈ کے سارے بچوں، سارے بستروں کے اطراف کراہتی اور سسکتی ہوئی زبانوں کو دلاسہ دینے کے لیے مسکراتے، ہنستے، شاداں و فرحاں چہرے بھی جمع ہو گئے تھے، مغموم اور ادا اس چہرے بھی۔۔۔ لیکن میرے پاس سوائے اس کے اور میری اپنی اداسیوں اور محرومیوں کے کوئی نہیں تھا اور اس کے پاس تو پتہ نہیں اس کی اپنی اداسیاں اور محرمیاں بھی تھیں یا نہیں۔

”ملنے والوں کا وقت اب ختم ہوا چاہتا ہے۔ آپ کو شاید اس ہنگامے سے اکٹھن ہو رہی ہے۔

میں نے اس کو جواب میں کچھ بھی نہ کہا۔ لیکن میری آنکھیں بڑی کس پرسی کے عالم میں ایک ایک چہرے کو تک رہی تھیں۔

وہ کیوں نہیں آیا۔

وہ بھی تو آ سکتے تھے۔

اور ہاں وہ بھی تو۔

لیکن کوئی بھی تو سہمے لیے نہیں آیا تھا۔

ہاسپٹل کے باہر پھری ہوئی شام کی اداسیاں رات کی پھیلی ہوئی سیاہ پادریں سمٹ رہی تھیں۔

ہاسپٹل کے باہر رات کا اندھیرا تھا۔

ہاسپٹل کے اندر بجلی کی روشنیاں۔

لیکن ہاسپٹل کے باہر ٹھہری ہوئی رات کا اندھیرا میرے اطراف پھیلی ہوئی

بجلی کی روشنی سے پتہ چل کر چھپ چھپ کر جانے کس طرح میرے سینے میں داخل ہو رہا تھا۔
 ”کیا اس قدر دیر اس کیوں ہو گئے ہیں؟“ اُس نے آخر مجھ سے پوچھ ہی لیا۔

”آپ اس قدر دیر اس کیوں ہو گئے ہیں؟“ میں نے اس کے سوال کو
 نظر انداز کر کے اسی سے سوال کیا۔

وہ مسکرایا بلکہ قریب قریب تنہس پڑا۔ پھر کہنے لگا۔
 ”تھاکتی اور دوڑتی ہوئی زندگیاں، ہمیشہ بھول اور مضمحل زندگیوں کو پیچھے
 چھوڑ دیتی ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ لیکن پیچھے پاٹ کر کبھی کبھی دیکھ لینے میں بھی تو کوئی حرج
 نہیں۔“

”ہاں۔ لیکن کون دیکھتا ہے؟“

”جو نہیں دیکھتے ہیں ان کا سوال نہیں لیکن جنہیں نہیں دیکھا جاتا وہ تمنا تو
 کر سکتے ہیں۔“

”یہ تمنا ہی پوری نہ ہو تو ایک اور راستہ بھی نکل آتا ہے؟“ اس نے بہت ہی
 رکتے رکتے یہ بات کہہ دی۔

”میں سمجھا نہیں۔ میں نے کہا۔“ میرے ذہن میں کوئی ایسا راستہ نہیں ہے۔
 ”یہی کہ ہم خود دوسروں کی تمنا پوری کریں۔ بالکل اس طرح جیسے انہیں
 بند کیے خند کو منا رہے ہوں۔“

”تو آپ ہی سب کچھ میرے ساتھ بھی کر رہے ہیں؟“
 ”میں بالکل آپ کے ساتھ کچھ نہیں کر رہا ہوں۔ آپ نے فی الواقع نہیں سمجھا۔“

میں کہہ چکا ہوں۔

— اور اس کے بعد ہم ایک دوسرے کے دست ہونگے۔

پھر میں نے اس کو ہمیشہ تم کہا اور اس نے مجھ کو۔

دوسرے دن شام کو جب ملاقاتیوں کا وقت شروع ہوا تو کہتے ہی

جانے پہچانے پہرے میرے اطراف تھے۔

کوئی مجھ سے کل کے نہ آکنے کی معافی مانگ رہا تھا۔

کوئی مجھے یقین دلا رہا تھا کہ اسے آج ہی معلوم ہوا ہے۔

کوئی مجھی سے پوچھ رہا تھا کہ ڈاکٹروں نے کیا کہا۔

کوئی حادثے کی تفصیلات جاننا چاہتا تھا۔

میں اتنے بہت سارے پوچھنے والوں کو دیکھ کر خوش ہی نہیں ہو رہا

تھا نیز محسوس کر رہا تھا۔ انھیں سب میں وہ بھی تھا۔

کبھی مجھے دیکھ رہا ہے کبھی سرے دیکھنے والوں کو اور ایک مستقل سکڑا

اس کے ہونٹوں پر اس طرح پھیلی ہوئی تھی جیسے کسی نئی نویلی دہن کے لبوں

پر سی کی دھڑی۔

پھر وہ کہیں غائب ہو گیا۔ جب سب لوگ جا چکے تو میری آنکھیں اس کی

استلاشی تھیں۔

آج ہاسپٹل کے یا ہر شام کی اداسی ہی بکھری ہی نہیں بلکہ شاید شام

ہی نہیں ہوئی۔

آج ہاسپٹل کے باہر رات کا اندھیرا جانے کب پیر و باکرہ آیا اور کھڑکیوں

سے جھانکتی ہوئی روشنیوں سے نظر پکارتا کنج کنج میں پھپکتا پھرا —
 ”آج تو تم مطمئن ہونا“ وہ میری باتیں سے نمودار ہوا۔
 ”کیوں؟“ میں نے دانستہ پہلو تہی کی۔

”آج جو اتنے بہت سارے لوگ تم سے ملنے چلے آئے تھے“
 مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں اس کا قصور دار ہوں۔ اور کل جو اس سے
 میری باتیں ہوئی ہیں اس کا احساس میری سرتوں پر پکڑا اس انداز سے پہلے
 بٹھا رہا ہے کہ میں رفتہ رفتہ اپنے ملنے والوں کی آمد پر خوش بھی نہ ہو سکوں گا۔
 لیکن رفتہ رفتہ خود میرے ملنے والوں ہی نے نہیں دوست احباب نے
 بھی آنا چھوڑ دیا۔

— اور اب میں بالکل اس کے حوالے ہو کر رہ گیا۔

اس کے دائیں پاؤں میں لنگ تھا اور اس کا بایاں ہاتھ سرے سے تھا
 ہی نہیں۔ ڈاکٹر دن نے اسے اجازت دے رکھی تھی کہ وہ دوا خانے کے پائین
 باغ میں صبح و شام چہل قدمی کرے۔ یہ چہل قدمی اس کے معذور پیر میں خون کی
 گردش اور روانی کے لیے ضروری تھی۔ وہ ویسے بھی دن بھر اپنے بستر پر کم
 ہی رہتا۔ صبح صبح وہ باغ میں چہل قدمی کر کے لوٹتا تو اپنے بستر کے پاس ناشتہ
 مل جاتا۔ اس کے بعد وہ دارو دار دگھوم کر ان سب کی خیر خیریت پوچھ آتا
 جن سے ہسپتال میں وہ دلچسپی لینے لگا تھا۔ اور اس خیر خیریت پوچھنے کا آغاز وہ
 بڈ نمبر ۵ کے مریض سے یعنی مجھ سے کرتا۔ یہ اس کی اپنی دانست میں آنکھیں
 بند کیے ہوئے تینہ کو منانے کی ادالتھی۔ اور یہ ادایتہ نہیں اس کو کس قسم کا

آرام بخشی تھی۔ میں تو صرٹ اتنا جانتا تھا کہ آنکھیں کھول کر سونے کا یہ سلیقہ اس لیے اسے آگیا ہے کہ وہ آنکھیں بند کر کے جاگتے رہنے کا سلیقہ بھی جانتا ہے میں نے کبھی یہ نہیں دیکھا کہ کوئی اس کا اپنا حال احوال پوچھنے کے لیے اس کے بستر تک آتا ہو۔ وہ دوسروں سے ہمدردی کر کے ان کی تمنا پوری کرتا ہوگا یا خود اپنی۔ لیکن اس کے خلوص اور محبت کے تعلق سے اس طرح سوچنا بچے کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔

اگر یہ اس کی اپنی تمنا ہی تھی تو کیسی چھوٹی ٹیسی تھی یہ تمنا، کتنی ننھی سی، کو مل سی اتنی سی۔ پھول کی پنکھڑی کی مانند۔ ہوا کے ایک تازہ جھونکے کی مانند۔ چھوٹی سی ایک سیپ کی مانند جس کے اندر کوئی گُوہر نہیں ہو۔ اس ننھے سے دیے کی مانند جو اندھیری رات کو کسی وسیع و عریض جنگل میں ٹٹمار رہا ہو۔

بھلا سا فراس روشنی سے راستہ پاسکیں گے؟۔

وہ ادھر ادھر جگہ کاٹ کر پھر میرے پاس آ جاتا۔

آئس کریم۔ شلٹری۔ موسمی۔ انجیر کچھ نہ کچھ میرے لیے آتا۔

میں کچھ تکلف سے کام لیتا تو وہ برہم ہو جاتا۔ وہ جب کبھی آئس کریم

لے آتا تو میں تکلف کم ہی کرتا۔ اور وہ بڑے چاؤ سے میرے کھلے ہونٹے منہ میں

چچے بھر بھر کے ڈالتا رہتا۔ پہلے چچے پر ناگوار ٹھنڈک کے احساس سے جب میں

منہ بناتا تو وہ بڑا محفوظ ہوتا اور میرے ساتھ ساتھ خود بھی منہ بنا کر میری نقل کرتا۔

ایک دن وہ مجھ سے کہنے لگا۔ ”کاموں میں کہتا تھا تا کہ تم اس لونڈے کے

تعلق سے غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہو۔ وہ بڑا نیک لڑکا ہے۔“

”پھر کون ہو سکتا ہے تمہارے اپنے خیال میں؟“

”میرے اپنے خیال میں تو میں ہی ہو سکتا ہوں۔“

”نہیں یا تم مدد کرو میری۔“ مذاق بہت ہو چکا۔

”تم رپورٹ کیوں نہیں کر دیتے؟“

”میں چاہتا ہوں خود اس دلچسپ آدمی کو پکڑوں۔ کبھی کبھی یہ بھی سوچتا ہوں کہ اس سلسلہ کو جاری ہی کیوں نہ رہنے دوں۔ ایسی کون سی بڑی رقم

لے جیتا ہے وہ۔“

”پھر بھی یا روزانہ کانٹکس جو لگ گیا ہے۔“

”میں نے کہا۔“ ایسا کون سا بڑا کانٹکس ہے۔ ہو گا کوئی ضرورت مند۔“

”چار آنے سے زیادہ لیتا ہی نہیں وہ۔“ اس نے پوچھا۔

”اسی نہیں کبھی نہیں۔ آپ دنیا بھر کی دولت سمیٹ کر رکھ دیجئے وہ

ایک چوتھنے لگے گا۔ آپ صرف پوتی رکھ دیجئے۔ وہ چوتھی لے لے گا۔“

”تم نے زیادہ سے زیادہ کتنے پیسے تکیے کے نیچے رکھے ہیں۔“

”۲۱ روپے ساڑھے بارہ آنے۔“

”اور جب صبح ہوئی۔“

”میں نے بات کاٹ کر جملہ پورا کیا۔“ تو صرف چار آنے غائب تھے۔“

”پہلے یہ بتاؤ تمہیں اس لڑکے پر شبہ کیوں ہوا۔“

”میں نے اس کو بتایا کہ جس رات یہ لڑکا میرے بلینگ کے برابر والے بستر پر

ایگیا تھا اس کے پہلے ہی دن اس نے مجھ سے دو آنے مانگے جو میں نے اس کو

دے دیے۔ دوسرے دن اس نے پھر مانگے۔ میں نے پھر دے دیے۔
تیسرے دن اس نے پھر اپنے مخصوص انداز میں آنکھیں بند کر کے ہاتھ پھیلا
دیا تو میں نے اس کو ڈانٹا کہ اس طرح مانگنا بری بات ہے۔ بس اس کے
دوسرے ہی روز سے چار آنے کا ٹکس لگ گیا مجھے۔

”اور کیا پھر اس نے کبھی پیسے نہیں مانگے؟“

”ہاں یہ بات تم نے ٹھیک کہی“ میں کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر مجھے خیال آیا
کہ درحقیقت بار اس نے مانگے تھے۔ لیکن میں نے انکار کر دیا تھا۔ یہی بار
میں نے اس کو بتلا دی۔

”تھیرت ہے؟“ اس نے تعجب کا اظہار کیا۔

”لیکن تمہیں کیوں اس کی پارسائی کا یقین ہے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

صبر نہ مجھے ہی نہیں۔ دوسروں کو بھی ہے اور تم سنو گے تو تمہیں بھی
ہو جائے گا۔

فطری طور پر میں نے تجسبی لی اور اس نے مجھے بتایا کہ نومبر ۱۹ کے مریض نے
دس روپے اور کچھ ریزنگاری ہاتھ و دم میں چھوڑ دی تھی جو اس روکے کے ہاتھ لگی
اور اس نے متعلقہ نرس کے توسط سے اس تک پہنچا دے۔

میں نے چھوٹے ہی کہا۔ ”اس میں یقیناً چار آنے کم ہوں گے“

وہ ہنسا، یا تم بھی کمال کرتے ہو۔ کم ہوتے تو وہ شخص بار پر سن نہ کرتا۔

کوئی ضرر دہی نہیں ہے۔ وہ یہ جان کر بھی خاموش ہو سکتا ہے کہ چار آنے
کی کمی کا اظہار خود اس کی اپنی پوزیشن کو خراب کر دے گا۔ لوگ یہی سوچیں گے کہ

لڑکے کی شرافت پر اس کو کچھ نوانے کی بجائے اٹے چوری لگا دی۔
 ”بھئی خوب دودھ کی کوڑی لائے ہو۔“

میں مسکرا کر خاموش ہو رہا۔

اس دن سے وہ بھی اس لڑکے پر نظر رکھنے لگا۔

ایک دن وہ میرے لیے میرا مرغوب پلم کیک لے آیا۔ پھوٹے پھوٹے ٹکڑے
 کر کے پلیٹ میرے سامنے رکھ دی۔ اور دنیا بھر کی باتیں کرتا رہا۔
 میں نے اس کو بتایا کہ آج ٹکس مجھے معاف کر دیا گیا۔
 ”چلو بھئی ہونی ہے“ وہ ہنسنے لگا۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر اس نے کہا۔ ”یہ کچھ زیادہ“

اچھا بھی نہیں ہوا یا ر۔“

”کیوں۔“ میں نے پوچھا۔

”اس لیے کہ راز راز ہی رہ گیا۔ جو انشا ہو جاتا تو اچھا تھا۔“

”یہ بات تو ہے۔“ میں نے بھی اپنا اشتیاق ظاہر کیا۔

لیکن دوسری صبح پورے آٹھ آنے غائب تھے۔ اور کچھ لٹکس بھی گویا اس
 طرح وصول کر لیا گیا تھا۔

میں نے اس کو بتا دیا اور ہم دونوں بہت دیر تک ہنستے رہے۔

اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ آج وہ اس بات کا پتہ چلا کر ہی رہے گا۔ خواہ

اسے رات بھر جاگنا ہی کیوں نہ پڑے۔

رات خود میرے پلنے تخت اشعور نے شاید مجھے ٹھیک سے سونے نہیں دیا۔

لیکن چور کا پتہ چلانے میں ہم دونوں ہی ناکام رہے۔

دن کو وہ حسب معمول آیا تو چاکلیٹ کا آئس کریم بار بڑی احتیاط سے پلا
کے کچھ ٹٹے سے لفافے سے نکال کر اس نے میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔

میں نے کہا۔ ”یار تمھاری اتنی ساری محبتوں کا بدلہ کس طرح چکا سکوں گا؟“
وہ بڑی مصومیت سے شرمایا۔ کہنے لگا، ”نہیں یار تم ایسی باتیں مجھ سے
مت کیا کرو۔ تمھاری اس غیریت سے مجھے بڑا دکھ ہوتا ہے۔ اور تم پتہ نہیں
مجھے کیا کیا سمجھتے ہو۔ میں اتنا اچھا آدمی بھی نہیں ہوں۔ تمہیں بتا دوں۔
بتا دوں تمہیں؟۔ پھر وہ کچھ دیر خاموش رہا۔

پھر کہنے لگا، ”خیر پھوڑو۔“ لیکن یار جی چاہتا ہے تم سے پیٹ کر خوب ردلوں۔
مجھے کچھ عجیب سا لگا۔ میں نے پھر اس سے پوچھا۔ ”تم کچھ کہتے کہتے کیوں رک
گئے؟۔“

”نہیں ایسی کوئی خاص بات بھی تو نہیں ہے۔“

”آخر کہو نا۔“

”میں کل جا رہا ہوں۔ کل دسپارچ کر دیا جاؤں گا۔“

میں نے نرس کو بلا کر اس بات کی تصدیق کی۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ
جب میں زخمی ہو کر آیا تھا تو اس نے اپنا پلنگ میرے لیے خالی کر دیا تھا اور
اور بڑی خوشی سے خود نیچے رہنے پر رضامند ہو گیا تھا۔

اور وہ دوسرے دن چلا گیا۔

آج پھر میرے دل کا عجیب حال ہے۔ میں اس روز بھی اتنا اداس نہیں
تھا جس روز کس مہر کی کے عالم میں پہلے دن ہاسپٹل میں پڑا تھا اور مجھ سے ملنے

کے لئے کوئی نہیں آیا تھا۔

میری آنکھیں مجھے یاد نہیں ایسے میں کبھی بھٹکی تھیں جب کہ کوئی جدا ہوتا ہے پھر آج مجھے یہ کیا ہو گیا ہے۔

جی چاہتا ہے وہ آئے اور میرے منہ میں آئیں کہ ہم ڈال کر خود منہ بنائے اور میری نقل اتارے۔

وہ مسرت ہو اس کو ایسا کرنے میں حاصل ہوتی تھی۔ مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ بد اسل وہ میری اپنی مسرت بھی تھی۔

اور اب شاید اس نے اپنا یہ فرض میرے سپرد کر دیا ہے کہ میں آنکھیں بند کیے ہوئے یمن کو مناتا رہوں۔

دوسرے دن میں نے دیکھا، پیسے برابر تھے۔ وہ مجھے یاد آیا۔

تیسرے دن میں نے دیکھا، پیسے برابر تھے وہ مجھے بے طرح یاد آیا۔

چوتھے دن میں نے دیکھا، پیسے برابر تھے، وہ آئینہ جو میں نے اس کے جلتے وقت اپنی آنکھوں میں پرتت چھپا رکھے تھے وہ آج تکیے کے نیچے پڑی ہوئی زیر کاری پر گر گئے ہیں۔

نچا ہوا البم

یہاں ایک چھوٹی ڈسی احاطے کی دیوار تھی۔ یا پھر ہری بھری ترشی ہوئی
 باڑھ تو تھی ہی، ادھر یہ دیوار یا باڑھ پکی سڑک سے متصل تھی لیکن آج سڑک پکی ہو گئی
 ہے، اور احاطے کی دیوار یا احاطے کی باڑھ کچھ بھی نہیں رہی ہے تو ایسا معلوم
 ہوتا ہے کہ مسافر بنگلے کو سڑک کے قریب سے زمانے نے جبراً اکھسیٹ کر دور کر دیا۔
 موٹر آگے بڑھ گیا تھا تو میں نے اس مقام کو پہچانا بھی نہیں، پھر کسی نے
 بریک لگا دی۔ وہ یاد جو چھپی ہوئی نکلیں میرے دل و دماغ میں سو رہی تھی
 بروقت چونک کر اکھٹ بیٹھی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی مسافر عین اس وقت
 سفر میں بیدار ہو جاتا ہے جب کہ ٹرین اس کی منزل سے آگے گزر رہی ہوتی ہو۔
 پچھلی جیب کار کے ایک شکاری نے مجھے ٹوکا جس نے دد نالی بند دق اپنے
 کندھے پر رکھ لی تھی، ادھر سے پر اتنے ٹوٹے آدیں راں کیے ہوئے تھا کہ انھیں دیکھنے

سے گھائل ہر نیوں کا خیال آتا تھا، پھر امی آنکھوں کا خیال آتا تھا، ایک بھکی کا خیال آتا تھا، ایک اکھڑتے ہوئے سانس کا خیال آتا تھا۔ اور میں نے اطران یادوں کی جو رنگارنگ محفل سجا رکھی تھی وہ ان تصورات کی تھیں نہ ہو سکتی تھی۔

میں نے اس سے ٹی سے کہا۔ ”بریک میں نے نہیں لگائی۔“

”پھر آپ ہی تو کار چلا رہے تھے؟“

”مجھے کب انکار ہے، لیکن یہ کوئی ضروری نہیں کہ جو کار چلا رہا ہو بریک لگانا

بھی اسی کے پس میں ہو۔“

وہ مسکرایا۔ کہنے لگا۔ ”کیا بات ہوئی؟“

”بات یہ ہوئی، کہ کار چلاتے وقت آپ کار یہی کی طرح سٹرک پر نہیں ہوتے

ہیں۔ آپ کا ذہن آپ کو کہاں کہاں لیے پھرتا ہے۔ جس منزل کے لیے آپ

ردانہ ہوتے ہیں، اس منزل کو کبھی آغاز سفر سے پہلے ہی جلیتے ہیں۔ اور جب

منزل پر پہنچتے ہیں تو منزل ہی کے تصور میں منزل پہچانی نہیں جاتی۔ ایسے میں

کوئی چپکے سے نکل آتا ہے جو کہیں دل میں بچھا ہوتا ہے اور بریک لگا دیتا ہے

۔ بتائیے، وہ بھی تو میں ہی ہوتا ہوں جسے خود میں بڑی مشکل سے پہچان پاتا ہوں

وہ مسکرایا، کچھ سوچ کر اس نے کہا۔ ”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں رات کے

سنائے میں، غنودگی کے عالم میں آر۔ ٹی۔ ڈی کی بچی سٹرک پر اپنی جیب دوڑاتا

رہتا ہوں، لیکن ان مقامات پر، جہاں سے مجھے ”انٹیریز“ میں جانا ہوتا ہے۔

میری جیب کے پیسے جیسے خود بخود جام ہو جاتے ہیں اور گاڑی ایک پانچ آگے نہیں

ادکے۔“ اس نے ہاتھ ہلایا۔ اور اس کی جیب ہوا سے باتیں کرنے لگی۔

وہ سارے درخت جیسے کے دیسے ہیں، گھٹنے گھٹنے، گمبھیر گمبھیر، چپ چاپ، بادل کی حصار اب پتھر دل سے پکی کر دی گئی ہے۔ میں مسافر خانے کے احاطے میں داخل ہو گیا ہوں جس کو نہ اب دیوار جھوڑے ہوں سب سے نہ ترشی ہوئی بارش۔ مسافر بنگلے کی پھلی جانب وہ گیٹ جوں کا توں کھلا ہوا جس سے ہو کر مجھے ریل کی پٹریوں تک جانا ہو گا۔ پھر ان پٹریوں کو عبور کر کے میں پلیٹ فارم پر پہنچ جاؤں گا۔ پھر اسٹیشن کے احاطے سے نکل کر میدان میں آ جاؤں گا۔ پھر اس کے بعد سیدھی سڑک، اور یہ سڑک مجھے اپنے بچپن تک لے جائے گی۔

میں نے اپنی فریاد کا رٹے جتن سے اس درخت کے نیچے ٹھہرا دی ہے، جس درخت کے نیچے میں گھنٹوں بیٹھا جلتے کیا کیا سوچا کرتا تھا۔

میں نے مسافر بنگلے کے خادم کو اشارہ کیا۔ اور اس کے بنگلے کے درجے اُردو دروازے اس طرح میرے لیے کھول دیے جیسے یادوں کی گھڑیاں کھول کھول کر دکھ رہا ہوں۔

”صرف ایک ہی کرسی اور وہ بھی اس طرح ٹوٹی ہوئی ہے!“

”نیا فرنیچر کچھ ہی دن میں، پلائی ہوئے والا ہے صاب!“

”اور یہ پلیس کیوں غائب ہیں؟ ٹنگ تو اسکل نیئی اور مکمل معلوم ہوتی ہے۔“

”کنکشن بھی آگیا ہے صاب، یلب بھی بس آج کل ہی میں پلائی ہوئے دے رہے ہیں۔“

لیکن سفید سفید ایسی ایسی گدا گدا مسمیتوں کی خواب ناک فضا میں سارا بنگلہ اس

طرح سانس لینے لگا جس طرح سیرے اطراف سجی ہوئی یادوں کی ایک چھوٹی سی دنیا میں میرا اپنا وجود سانس لے رہا تھا۔

مجھے مسافر بننے کی دہ۔ اتیں یاد آئیں جب خانوس میں جلتی ہوئی کسی موم بتی کو میرے زوم ہاتھ آہستہ سے بڑھ کر خانوس سے جدا کر دیتے تھے۔ اور پھر موم بتی کے گرم آنسوؤں کی حدت میں کبھی اپنی انگلیوں پر، کبھی اپنی ہتھیلی پر، کبھی اپنے ہاتھ کی پشت پر محسوس کرتا تھا۔ مجھے موم بتی کے ان اشکوں کو جمع کرنے کا عجیب شوق تھا، جو سرد ہو کر سوتی بن جاتے تھے۔ اپنے یہاں ہاتھ کی اداس سے کلپنتے ہوئے شعلے کو پھیلانے، بائیں ہاتھ میں موم بتی کے گداز جسم کو تھامے میں جب میر کی سطح پر پچھلی رات بہائے ہوئے اس کے اپنے اشکوں کے نشانات تلاش کرتا تو وہ مسک مسک کر آنسو بہاتی۔ یہاں تک کہ اس کا وجود اشک بن کر بہہ جاتا۔ اور پھر یہ آنسو موتیوں کی طرح جن لیے جاتے۔ اور میری خوبصورت سی ڈیہا میں محفوظ ہو جاتے، جنھیں میں شامی کو تحفے کے طور پر دیتا اور وہ ان موتیوں سے جلتی۔ اس وقت شامی میرے ساتھ ہے، ہمارے تینوں بچے بھی ساتھ ہیں۔

شامی مجھ سے کہتی ہے۔
 ”آپ یہاں آکر کچھ کھوسے گئے ہیں“

شامی سچ ہی تو کہتی ہے، میں اسے نہیں جھٹلاتا ہوں۔

”تم لوگ ذرا استالو، میں سبتی میں گھوم آؤں“

”تہا کیوں جانیے گا۔ چلے موڑ ہی پر چلتے ہیں“

”تم سن لیں۔ اس موسم میں ہیل قدمی کا لطف اور یہ ہے“

دہ برساتی میری طرف بڑھادی ہے۔ اور بچوں کے ساتھ مسافر بننے کے بارگاہ میں چلی جاتی ہے۔

چھوٹو مجھے ٹوکتا ہے۔ ساتھ چلنے کے لیے ضد کرتا ہے۔ شامی اسے پکارتی ہے، اور میں چپکے سے نکل جاتا ہوں۔ سافر خانے کا پچھلا لکٹ پارک کرنے کے بعد میں پلٹ کر دیکھتا ہوں۔ شامی چھوٹو کو ششنگ کرتی ہوئی مال گاڑی دکھلا کر ہسلا رہی ہے۔

میں ریلوے لائن پارک کے پلیٹ فارم پر پہنچ گیا ہوں۔ یہاں مجھے میرا اپنا بچپن مل گیا ہے جیسے وہ برس برس سے میرا منتظر تھا۔ میں بڑھ کر اس کو تھاں لیتا ہوں۔ لیکن وہ ضد کرتا ہے۔ میں اسے گود میں اٹھا لیتا ہوں۔ وہ پھر بھی ضد کئے جاتا ہے۔ میں سمجھنا چاہتا ہوں کہ وہ آخر کیا چاہتا ہے۔ وہ میری آنکھیں میچ دیتا ہے۔ میں اس کی ضد کا سبب سمجھ لیتا ہوں اور آنکھیں بند کیے اسی کی آنکھوں کے سہارے آگے بڑھنے لگتا ہوں۔ وہ مجھے راستہ دکھانا جاتا ہے۔

سیدھی جانب یہ جو ہاسٹل کی عمارت جو یہ بالکل حال ہی میں تیار ہوئی ہے۔ میرا بچپن جس کی آنکھوں سے میں سب کچھ دیکھ رہا ہوں۔ خود اس عمارت کو نہیں پہچا وہ مجھ سے سرگوشی کے انداز میں کہتا ہے۔ میں پلیٹ فارم پر تھا را اس وقت سیدھے نظر ہوں جب کم عمری میں تم مجھے یہاں چھوڑ گئے تھے۔ میں نے پھر کبھی بستی کا رخ نہیں کیا ہے۔ لیکن پھر بھی میں تم سے زیادہ ان راستوں سے مانوس ہوں۔

یہ ایک وہ موٹر آگیا ہے جس موٹر پر کھوت رہتے تھے۔ جڑیاں سہتی تھیں۔ ریلوے سے چکر کاٹ کر گزرنے کی بجائے فنا صلہ کم کرنے کے لیے ہم اسی موٹر سے ہو کر گزرتے تھے۔ ریل گاڑیوں کا سلسلہ ختم ہوتے ہی، دراصل یہ ایک چھوٹا سا دیران میدان ہے جس کو نیم اور پیل کے گھنے قد آور درختوں نے اپنے سالیوں میں چھپا رکھا

ہے بستی سے نشیب میں ہونے کے باعث اطراف کا بہتا ہوا برساتی پانی یہاں
 آکر خانہ بدوشوں کے قافلوں کی طرح بکھڑ جاتا ہے۔ لیکن شاید یہ قافلے اپنا سفر
 جاری رکھنے کی سکت کھو بیٹھتے ہیں جو مستقل طور پر کھوت پریت کے بلحقوں مقید
 ہو کر یہاں کے ہو رہتے ہیں۔ گاؤں کے اکثر سوکناروں کی کچھڑ میں طبقاتی نظام
 کے خلاف کانفرنس کرتے ہیں۔ چھوت چھات کے مسئلہ پر گرگرم بحث کرتے ہیں۔ اور
 پھر کچھ ہی میں سو رہتے ہیں۔ اس آسیب زدہ میدان کی دیواروں میں مخلوق ہی ہو
 اس میدان کی ساری زمین سیلی ہوئی ہے۔ غم ہے۔ میں، شامی اور دوسرے بچے
 اس میدان میں سے بک ٹپ بھاگ کر شکر کے ایک کنارے سے دوسرے
 کنارے تک پہنچتے ہیں۔ اور بہادری سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔
 چہرے سب کے قتمائے ہوئے ہیں۔ شامی تو بس لال لال ہو کر رہ گئی ہے۔ کوئی
 کہتا ہے جب میں میدان کے بچوں بیچ پہنچا تھا تو میرے انگ پر کانے آگئے
 تھے۔ دوسرا کہتا ہے کہ میں نے تیسرے درخت کی سب سے نیچلی شاخ کے پاس
 سسکیوں کی آواز سنی ہے۔ کوئی اضافہ کرتا۔ وہ دیکھو۔ یہ۔ وہ۔ وہ۔
 وہ غائب ہو گیا۔ شامی میرے پیچھے چھپ جاتی۔ پھر ہم گاؤں کی فضیل کی طرف
 بڑھ جاتے۔

میرا بچپن مجھے اس آسیب زدہ میدان میں چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا ہے۔ اور
 شکر کے کنارے میرا منتظر ہے۔ میں ایک درخت کو تک رہم ہوں۔ اس کے
 گھنے سائے کو تک رہم ہوں۔ زمیں کی وہی سیلن اور آج بھاجوں کی توں ہے۔
 ٹھہرے ہوئے پانی کے کناروں کی کچ پر آج بھی خنزیر جمع ہیں۔ لیکن وہ آسیب

کہاں چلے گئے۔ وہ چڑھیں کہاں چلی گئیں۔ جو میرے بچپن نے اپنی رچ بس کے لیے اس میدان میں بسا رکھے تھے۔ بس ایک دیرانی سی لچ بھی اس مقام پر سلاخ ہو۔
 فضیل کے قریب سڑک کی دونوں جانب کچھ دوکانوں کا اضافہ ہو گیا ہے
 ایک ٹیکسی سائیکل کی دوکان، ایک آٹے کی گرنی، ایک موچی کی دوکان جو صرف
 پھل بناتا ہے۔

بس فضیل کے دروازے پر کھڑا ہوں۔ یادوں کی ایک دنیا اپنے سینے میں
 بسائے ہوئے۔ فضیل کے دروازے میں دونوں جانب سائیکلوں کے نیچے آج
 بھی وہ تخت جوں کے توں پڑے ہیں۔ جن پر فوبت نواز بیٹھتے تھے۔ ایک تخت
 پر ایک بڑا سا علم بٹھایا گیا ہے۔ جس کے سامنے آٹھ ٹیبلٹیں ہیں جو جیل رہا ہے۔
 اس کے مقابلے کے سامان میں آدھے تخت پر پان سگریٹ کی ایک چھوٹی سی کان
 لگائی گئی ہے۔ آدھا تخت پر دس کے نیچے چھپا ہوا ہے، جہاں سے دھواں اٹھ
 رہا ہے۔ اور کوئی کھانسی کھانسی کر چوٹھا پھونک رہا ہے۔

میرے کانوں میں نفیہ یاں اور فوبت لچ رہی ہے، میں سر جھکائے فضیل کے
 دروازے میں داخل ہو گیا ہوں۔ سر اٹھاتا ہوں تو سامنے بسی کی شاندار چادر ڈھکی
 پر نظر پڑتی ہے جس میں لچ بھی پولیس چوکیاں قائم ہیں لیکن وہ مظنہ کہاں!
 میں بڑھتا رہتا ہوں کہ کوئی میرے قدم کھام لیتا ہے۔ میں بائیں جانب
 مڑ جاتا ہوں۔ یادوں کی اس دنیا میں جو میرے ذہن و دل میں بسی ہوئی ہے ایک
 ہنگامہ سا ہو جاتا ہے۔ میرا بچپن ایک ایک تصویر میرے اہم میں سے لے کر وہی
 سے کھینچ کر نکال رہا ہے اور میرے اطراف تصویریں ہی تصویریں کھینچ رہی ہیں۔

شب نے کرکٹ کا ملا پوری طاقت سے گھمایا ہے۔ میں نے وکٹ کے پیچھے اس کی گیند پکڑ لی ہے اور اس کو اسٹمپ کرنے کی کوشش میں بے ہوش ہو گیا ہوں۔ سارے ساتھی میدان سے فرار ہو گئے ہیں۔ لیکن ایک بھگ دوڑی گئی ہے۔ چیرا سی صیغہ دار سب ہی دوڑ پڑے ہیں۔ ابابھی اپنے اعلا س کے ٹھاٹھ باٹ اور رعب داب بھول بیٹھے ہیں۔ ان کی متین اور سنجیدہ حال جس کے متبی بھر میں چرچے تھے۔ ان کا پر تکنت اندازہ خرام جس کی لوگ باتیں کرتے تھے سب دھرا کا دھرا رہ گیا ہے۔ اور وہ بے تحاشا بھرتک پہنچنے کے لیے بانڈازہ دگرتے ہیں۔ جب مجھے ہوش آیا تو ہنوں نے بتلایا کہ شامی کے آنو ایک لمبے کیلے خشک نہیں ہوئے۔ شامی آئی تو مجھے سکرا سکرا کر دیکھا۔ کہنے لگی۔ ”میں بہت روٹی کھا رہی تھی۔“

”تو کون سی بہادری کی بات ہوئی؟“ میں نے اپنی خوشی کو بھرا کر کہا جو تاج کیوں مجھے شامی کے رونے کی بات سن کر ہوئی تھی۔

”تو کون تجھیں بہادری بتاتا ہو جی؟“ وہ جھگڑنے لگی۔

میں نے اس کو پھر چھیڑا۔ ”پھر اتنے بہت سارے آنو کیا کہو دیے تم نے؟“

”کیا کر گئے کر؟“

”اسی ذبیہ میں رکھ لوں گا جس میں موم کے آنو کھا رہے لیے جمع کرتا ہوں؟“

”میرے آنو موم کے آنو کی طرح ہاتھ نہیں لگنے کے؟“ وہ سنہی اور بھاگ گئی۔

کیسی کیسی یادیں۔ مداری کی پٹاری سے سراٹھا کر بچھن پھیلائے چھوٹے والی ناگنوں کی طرح صر جھوم نہیں رہی تھیں؟ دس بجی رہی تھیں۔

میں سبکی کی سب سے اونچی عمارت کے سامنے کھڑا ہوں۔ یہ ابابکا دفتر تھا۔ اب یہاں ضلع پریٹ ہائی اسکول ہے۔ تعطیل کے روز جب کہ دفتر بند ہوتا تھا، ہم بچے جمی بھر کے ادھم مچاتے تھے۔ گھنٹے گھنٹے نیم کے بیڑوں کے نیچے بکھری ہوئی بچی بچی بنویاں جن کی حافی تھیں۔ پھر دوکانیں سمجھتی تھیں۔ لیکن اس دوکان داری میں میرا حصہ بس اتنا ہوتا کہ نیم کی شاخیں ہلا کر بچی بنویاں اپنے پھوٹوں کے نیچے بٹھا ڈرتا۔ یعنی میں عمر کی اس منزل میں تھا جہاں ہاتھ بڑھا کر کسی مغرور شاخ کو جھکا دینے میں آدمی بڑائی کرتا ہے۔

ضلع پریٹ کے اس ہائی اسکول میں جہاں اب بے شمار فتنی فتنی زندگیاں کو ملیں کو ملی ذہن، ناپختہ شعور اور پختہ ارادوں واسطے نو عمر اپنے مستقبل کے بنانے اور سنوارنے میں کوشاں ہیں وہیں میرا ماضی بھی گوشے گوشے میں چھپا بیٹھتا ہے۔ میں نے زندگی کے اپنے اس سفر میں کیا کیا کھویا ہے۔ اور کیا کیا پایا ہے، اس سے میرے اس کھلندر بچپن کو کوئی واسطہ نہیں ہے۔ وہ تو مجھ سے اسی بانچیس کے ساتھ ملتا ہے۔ لیکن میں جانے کیوں ایک کھنگنتی ہوئی ہنسی بھی اس کی نذر نہیں کر سکتا ہوں۔ اور آگے بڑھتا ہوں یہ ہمارا مکان ہے۔ میں مکان کے صدر دروازے تک آ رہا ہوں صدر دروازہ جیسے صرف میرے لیے کھلا رکھا گیا ہے۔ میرا اشتیاق کس قدر بڑھا گیا ہے۔ گھر میں اپنے ہی گھر میں اس طرح داخل ہو رہا ہوں۔ جیسے کسی دوسرے کے گھر اپنی کوئی سہیل سے زیادہ قیمتی شے تلامش کر رہا ہوں جو گم ہو گئی ہے۔ دروازے کے نیچے حسرت سے تکیا رہے ہیں یا میں کہیں حسرت سے تکیا رہا ہوں۔ فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ حسرتیں مشترک ہیں۔ میں احتیاط سے قدم بڑھاتا ہوں، یادوں کے اس جھرمٹ میں کسی کو نظروں سے گدگداتا ہوں۔ کسی سے

نظر میں چراتا ہوں اور آگے بڑھتا بڑھتا آہستہ آہستہ اس دروازے تک آپہنچا ہوں جہاں سے مجھے اپنے گھر کے اندر دنی جھلے میں داخل ہونا ہے۔ لیکن دروازے پر قفل لگا ہے۔ میں تڑپ کر رہ گیا ہوں، جیسے کوئی دودھ پیتے بچے کو اس کی ماں کے سینے سے جھپٹ لے۔ کاش یہ دروازے ایک بار میرے لیے کھل سکتے۔ یہ باہیں ایک بار میرے لیے وا ہو سکتیں۔ پتہ نہیں میں پھر کبھی ادھر آ بھی سکوں گا یا نہیں میں اپنی آنکھیں دروازوں سے لگا دیتا ہوں، لیکن کوئی درزن در نہیں چوڑھے اندر کی خاموشیوں میں بسبی ہوئی دنیا کا فظا رہ کر اس کے جس کو اب اس سیتی بھر میں صر ت میری آنکھیں دیکھ سکتی ہیں کتنی آوازیں میرے کانوں میں گونج رہی ہیں۔ میرا بچپن تراشہ رہا ہے، ترا ظالم۔ اس نے ابھم سے نکال کر ساری کی ساری تصویریں میرے ادیر ہوا میں اچھال دی ہیں اور میں دیوانوں کی طرح ایک ایک تصویر پر چھپٹ رہا ہوں جو میرے اطراف زمین پر بٹھیر ہو رہی ہیں۔ لیکن میں جھک کر دیکھتا ہوں تو زمین پر کوئی تصویر نہیں ہے۔ عمر رفتہ کا کوئی نقش پائ نہیں ہے۔

مقتل دروازے پر، چلڈرن دلیفر سنٹر کی تختی لگی ہے۔ میں اسی آنے والی نسل کو اپنا ابھم سوچ کر لوٹ رہا ہوں جس کی تصویریں فونج لی گئی ہیں۔ باہر نکلتا ہوں تو بارش شروع ہو چکی ہے۔ لیکن ایک نوجوان بند کھڑکی کے سائبان کے نیچے کھڑا اپنا چہرہ کھڑکی کے پٹ پر جمائے درزن میں سے جھانک رہا۔ میں اپنی برساتی کتیں بھول آیا ہوں۔ ادھر ادھر دیکھتا ہوں برساتی صدر کے شے نشین پر دھری ہوئی مل جاتی ہے۔ میں سے ادھر کر باہر نکل آیا ہوں۔ نوجوان ہے خیر ہے۔ جب میں اس کے قریب نظر میں جھکائے گزرتا

ہیں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ کھڑکی کے اندر دنی پٹوں پر بھی کسی کے جلتے ہوئے ہیں
 بال رکھے ہوئے ہیں۔ چپتے ہوئے ہونٹ رکھے ہوئے ہیں۔ میرے دہلے دہلے
 دیووں کی چاب سُن کر نوجوان میری طرف دیکھتا ہے میں بھی باوجود اس کوشش کے کہ
 میں کو اس بات کا احساس نہ ہو کہ میں اس راز دنیا کو تار گیا ہوں ماس کے
 ہونٹ دیکھے بغیر نہیں رہ سکا۔ اس کی ناک اور گالوں پر کھڑکی کا ہر رنگ نمایاں
 نور پر لگ گیا ہے۔ یہ ان بوسوں کی حسرتیں ہیں، جو انہیں لئے جا سکے۔ نوجوان
 میں بات سے بے خبر ہے کہ اس کی یہ حسرتیں اس کے چہرے پر ابھر آئی ہیں۔
 جیسے اس راہ گیر نے دیکھ لیا ہے جس سے اس کی آنکھیں ابھی ابھی چار ہونی تھیں۔
 در واقعی میں نے سب کچھ دیکھ لیا ہے۔

شامی میری منتظر ہوگی۔ چھوٹو میرے لیے ضد کر رہا ہوگا۔ حذر اور بٹیا اسے
 بلا رہے ہوں گے۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا، مسافر جنگے کی طرف لوٹ رہا ہوں۔
 میں نے اپنے بچپن کو جو ٹیشن سے سنی تک میرے ساتھ آیا تھا، یہیں چھوڑ دیا ہے۔
 میں پھر ادا اس ہو گیا ہوں۔ جی چاہتا ہے سارے آنسو شامی کے دامن کی بھینٹ
 بڑھا کر خاموش موجاؤں۔ پھر خیال آتا ہے کہ خود اس کے پاس ان آنسوؤں کی کمی
 نہیں۔ میرے پاس رہ ہی کیا گیا ہے جو شامی کو دے سکوں۔ سو مہینے کے آنسوؤں
 سے کھیلنے والی یہ لڑکی اپنے دامن میں آنسوؤں کی کتنی ہی دولت سمیٹے ہوئے ہے
 دہموتی تو نہیں بنی ہے اس کی آنکھوں میں کنکریں کرکھٹکتے ضرور ہیں۔

اس غم کی اس بات کیا ہے۔ کچھ بھی ہو۔ لیکن پھر کسی کی یاد میرے ذہن میں مرسا
 دل میں میری روح میں اپنا زہر قطرہ قطرہ کر کے ٹپکار رہا ہے ابنا زہر جواب

میری نس نس میں سرایت کر کے مجھے پیارا ہو گیا ہے۔ ہر وہ غم جو زندگی کے کسی رخ سے بھی مجھ تک پہنچتا ہے۔ ہر پھر کہ اسی ایک یاد سے وابستہ ہو جاتا ہے جسے میں نے بڑے جتن سے اپنے سینے سے لگا رکھا ہے۔ یہ بھی ایک بارہ سالہ کھلڈرے شہر لڑکے کی یاد ہے۔ یہ وہ لڑکا نہیں ہے جو آئین سے بستی تک میرے ساتھ تھا۔ اور جس کو میں ابھی ابھی بستی میں تنہا چھوڑ کر آیا ہوں۔ یہ لڑکا تو اس لڑکے کی زندگی بھر کی تنہائی ہے۔ یہ لڑکا تو اس لڑکے کی تکمیل کا نام ہے، جو نہ ہو سکی نہ ہو سکے گی۔۔۔ یہ لڑکا سیرا بچہ ہے۔ میرا بیٹا۔ میری جان۔

اس لڑکے نے اپنا بارہ سالہ خوبصورت ماضی مجھے سونپ دیا ہے۔ اور اس ڈھنگ سے سونپا ہے کہ یہی بارہ سالہ ماضی اس کا حال بھی ہے، اس کا مستقبل بھی اس نے سوا اس کا نہ کوئی حال ہے، نہ کوئی مستقبل۔

مجھے یاد ہے، ایک بار اس نے اپنے پڑوس کی، ساتھ کھیلی ہوئی لڑکی سے کہا تھا۔ ”ممنی“ میں تجھے اپنی بہن نہیں بناؤں گا۔“

اس بہن نہ بنانے میں کیا کچھ نہ بنا لینے کا جذبہ تھا۔۔۔ میں بھانپ گیا تھا اس تاڑ گیا تھا۔ طوفان کی آمد آمد کو میں نے پہچان دیا تھا نا۔۔۔ میں نے اس سے پوچھا تھا۔

کیا بنائے گا پھر؟

اس نے مجھے جھکی جھکی شریلی نظروں سے دیکھا تھا۔ میں نے اتنی خوبصورت جھکی جھکی نظریں آج تک نہیں دیکھی ہیں۔ یہاں تک کہ میں نے خود اس کی بھی ایسی جھکی جھکی نظر پھر کبھی نہیں دیکھی۔

وہ ایک دن کھیلتا کھیلتا منجھ سے، شامی سے، اپنی چھوٹی بہن اور چھوٹے بھائی کو
 جدا ہو گیا۔ اس طرح جدا ہو گیا جیسے کوئی آنکھ مجھولی کھیلنے کے لیے لمحے بھر کے لیے
 انا چاہتا ہو، پھر سامنے آنے کے لیے۔ لیکن وہ لمحہ ہی ٹھہر گیا جس لمحے وہ چھپا تھا۔
 لوگ کہتے ہیں وقت ہر زخم کو مند مل کر دیتا ہے۔ میں سوچتا ہوں، کاش ایسا
 نہ ہوتا، شاید وقت اس زخم کو مند مل نہیں کر سکتا، جو وقت کے ٹھہر جانے سے انا
 دل پر لگتا ہے۔

میرا بچپن جسے میں ابھی ابھی بستی میں چھوڑ آیا ہوں، دبے پاؤں میرے پیچھے پیچھے
 ہاں تک چلا آیا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر میرے ہاتھ تھام لیے۔ مجھے غور سے دیکھا۔
 کیا تم وہی ہو جنھوں نے مجھے ابھی ابھی بستی میں تنہا چھوڑ دیا؟

کیا تم میری تلاش میں یہاں تک نہیں آئے تھے؟

میں نے منہ پھیر لیا، تو اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیے۔ ٹھیک ہے، آج سے میں بھی اسی کو
 غور سے دیکھتا ہوں، لیکن کیا اس تلاش میں ہم کبھی ایک دوسرے کو پہچان سکیں گے؟
 میں لپٹ کر دیکھے بغیر آگے نکل آیا ہوں۔

چھوٹو ضد کر رہا ہوگا۔

ندو۔ بیٹیا۔

ابھیں خوب چوسوں گا۔ لیکن عین اس وقت کوئی اپنا گال بھی تیرے ہونٹوں پر رکھ دے تو؟
 میری اور شامی کی محبت کا پہلا حق دار تو آج بھی وہی ہے نا۔

میرے بہرے پر ان بوسوں کی حسرتوں کا کون سا رنگ ابھرے گا؟

بہادر

مصنوعی سلک کی سفید قمیض، بھر داں چوڑی کی نئی تہہ، شکل کا طرہ نمایاں،
نمایاں، جبرٹوں میں پان کا بیڑہ دبائے علی بہادر ضلع کی سستی سے گزرتا تو ہنس ہنس کر
سلام کرتا بھی سلام لیتا بھی۔ پولیس ایکشن کے بعد اس نے حیدر آباد کی کورٹس بجانا
چھوڑ دیا تھا۔ بڑے ادب سے منستے کرتا: دونوں ہاتھ جوڑ کر۔ علی بہادر کو سلام کا یہ
نیا طریقہ اس لیے راس آیا کہ اس کی دستی گھڑی کی تائش آسانی سے ہونے لگی علی بہا
رستینیں اٹھائے رکھے بھی تو سارا زمانہ کام دھندہ چھوڑ کر گھڑی کو تیکنے سے رہا۔
’نستے‘ میں یہ مشکل آسان ہو گئی تھی۔

جب سے ضلع کا نیا عہدے دار آیا تھا، علی بہادر پر سلاموں کی بارش ہونے
لگی تھی پیشی کا چپر اسی اوردہ بھی منہ چڑھا۔ دفتے میں علی بہادر کی چلتی، گھر میں علی بہا
ر کی۔ اور اب تو سستی بھر میں علی بہادر کی چلتے لگی تھی۔ عہدہ دار تو دیکھتا بھی آسمان

کی طرف تھا چلتا بھی آسمان ہی پر تھا۔ وہاں تو فرشتے بھی وہی تھا عرش بھی وہی۔ مگر علی بہادر تو اسی زمین کے بسے دانے تھے۔ چھوٹوں سے سیں جوں بڑوں سے سیں ملاپ۔ جتنے آداب سلام، آسمان پر نظر رکھنے کی وجہ سے عہدہ دار تک نہ پہنچتے اور زمین ہی پر ادھر ادھر دھیر ہو جاتے، وہ سب کے سب علی بہادر سمیٹ لیتے۔

علی بہادر پہلے بھی چپراسی تھے۔ آج بھی چپراسی ہیں۔ لیکن آج جو اہمیت انھیں حاصل ہو گئی تھی وہ نئے عہدے دار ہی کی جوتیوں کا طفیل تھا۔ اسی احساس نے علی بہادر کو اس قدر وفادار بنادیا کہ وہ جلو توں سے اٹھ کر عہدے دار کی خلوتوں تک چلا پہنچے اب تو وہ منہ چڑھے پیشی کے اردلی ہی نہ تھے، ہم راز بھی تھے۔ ہم سفر بھی۔

نظام باڈے سے بی جانی کو ساتھ لے کر کچی سڑک تک پہنچتے پہنچتے علی بہادر نے کہنے ہی سلام لے، کہتے ہی نظر انداز کر دیے۔ وہ گزر گئے تو سلام کرنے والوں اشاروں کنایوں میں باتیں کیں۔ کچھ اور آگے بڑھ گئے تو سرگوشیوں تک ذہن پہنچی۔ بی جانی لاکھ بوتلے میں ہوں۔ بدن کے پیکٹے ہوتے شعلے اپنی ٹوکیلی زبانیں برقعے کے باہر بھی تو نکال نکال کر راہ چلتوں کو ڈستے ہیں۔

بی جانی کو کچھ ایسے زیادہ دن بھی نہیں ہوئے تھے کہ اس کے بچپن کے خاموش سے ٹھہرے ہوئے پانی کی سطح پر اس کی جوانی نے ایک پتھر دے مارا اور شانتی تڑپ تڑپ اٹھی۔ پھوڑے، گھوڑے اور مالیدے کی قاب کچے رنگ میں رنگے ہوئے لاکھ پٹے سے ڈھانک کر بی جانی کی نانی صرف دو ایک گھر دن ہی میں دے آئی جس سے تعلقات بہت گہرے تھے ان میں سے ایک گھر تو ایسا بھی تھا جہاں بی جانی کی بات بچی ہو چکی تھی۔ نانی نے سوچا اب ایسوں سے بھی کیا چھپانا جو بھولی پھیلائے ٹھیکر سی

مذبح کے پیچے بیٹھے ہیں کہ بھل چکے ہیں ہی پٹنہ سے اسی بھولی میں گسے گا۔ ہاں پر اسے
البتہ پر اسے تھے اور پھر اسی میں مصلحت بھی تھی کہ بی جانی آسانی سے گھوم پھر سکتی۔

نانی راز کے پردے بی جانی کی جوانی پر ڈال کر مطمئن ہو بیٹھی کہ جہاں وہ چاہے
گئی پس وہیں یہ راز افشا ہو گا۔ لیکن علی بہادر برقعے میں ڈھکی ہوئی بی جانی کو لے کر
پکی سڑک تک ہی پہنچے تھے کہ لونڈوں نے ایک دوسرے کے کہنیاں ماریں۔
ٹھوکے دیے۔

”نمبر پر آگئی ہے خان“

”اب تو برقعے بغیر نکلتی ہی نہیں“

”کیا پٹا تھ تھی یار“

لیکن علی بہادر کس گھر کے کس پتھر پر اس پٹانے کو دے ماریں گے ابھی اس
کا علم کسی کو نہ تھا۔

پولیس ایشن نے خاص طور پر اس ضلع کے مسلمانوں کی اکثریت کو آزادی کے
نام پر اتنا ادھر اٹھایا تھا کہ وہ اس زمین سے اٹھ کر سیدھے آسمانوں تک جا پہنچے
تھے۔ کتنی مائیں اپنے گردیل نوجوان بیٹوں کو گھوچکی تھیں۔ کتنی بہنیں اپنے بھائیوں
کو کتوں کا سہاگ اجڑ چکا تھا۔ کتوں کی محبت لٹ چکی تھی۔ اور ضلع کے کون سے
گلی کو چوں میں اب یہ آہیں۔ بازار میں کہنے والا جسم بن کر رہ گئی ہیں۔ اس سے
کھی بہادر واقف تھے۔

ایسا ماحول جو ضلع کی بستی کے ہر کس دنا کس کی دسترس میں ہوتا، اس کی

حکم حاکم کو انھوں نے یہ درجہ دے رکھا تھا وہ تو کوئی صاحبِ ایمان جاننے لیکن کہتے وہ ضرور کچھ اسی طرح تھے۔

”نہیں بھئی سویا رکھا چکی ہے جس کسی نے سچری کی وہ ہمارے ایمان سے خارج ہوئی۔“

انھیں کرکٹ کی سچری والی بات بہت بھاگئی تھی۔ شاید اس لیے کہ اس میں ”سویا رکھا چکنے“ کا عامیانہ پن نہ تھا۔ معنویت بھی تھی، اختصار بھی، نفاست بھی۔ اب وہ بہت آسانی سے کہہ دیتے۔

”نہیں بھئی سچری کر چکی ہے۔“

علی بہادر نے ایک دن اپنے صاحب سے کہا بھی۔ انھیں ڈرتے مرنے سمجھایا بھی کہ سرکارِ جتنی اب تک ہم چکی ہیں انھیں میں سے جو زیادہ پسند ہوں انھیں پھر لے آؤں۔

حاکم نے صبراً اتنا ہی کہا ”علی بہادر کیا ہم اپنی دھرم بتی کو اسی لیے شہر میں چھوڑ آئے ہیں کہ یہاں آکر کسی ایک عورت کے ہو رہیں۔ اگر یہی کرتا ہوتا تو ہماری دھرم بتی بھی اتنی گہری نہیں ہیں۔“

علی بہادر پر جیسے گھر دوں پانی پڑ گیا۔ وہ بھینکا ہوا مرغ بنا حاکم کے سامنے کھڑا رہا۔

”اچھا حضور“ اور انھوں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر بڑے ادب سے منستے کیا۔

وہ جانے لگے تو حاکم نے پوچھا ”سمجھ گئے نا۔“

”ہاں صاحب۔“

علی بہادر باہر نکلے تو انھوں نے سوچا، اس تعداد میں تو بالکل نیا مال نہیں ملنے کا۔ صاحب کے منہ کو خون لگ گیا ہے۔ اس لگے ہوئے خون کو دھو ڈالنے کی ترکیبیں وہ سوچنے لگے۔

علی بہادر تو یہ چاہتے تھے کہ اتنی بہت سوں میں سے ”صاحب“ کسی ایک کا ہو کہ رہے۔ ایک کا نہیں دو کا۔ دو کا نہیں چار کا، پانچ کا اس سے ان کا کام بھی ہلکا ہوتا تھا، ذمہ داریاں بھی کم ہوتی تھیں۔ صاحب کی زندگی بھی ایک ڈگر پر چل پڑتی اور وہ بھی حسین اور اطمینان سے ان نعمتوں سے استفادہ کرتے جو صاحب کی مہربانیوں کی وجہ سے خوش حالی بن بن کر ان کے راستے میں بچھ رہی تھیں۔

ایک روز علی بہادر ایسے مقام پر جانکے جہاں کا آنا جانا انھوں نے عرصہ سے چھوڑ رکھا تھا۔ انھیں مدتوں بعد ادھر کا رخ کرتے ہوئے ان کے جیلوں نے دیکھا تو بس دوڑ ہی تو بڑے۔

علی بہادر نے کہا۔

”لاؤ بھی کوئی سبھی ہی سہی“

علی بہادر کے ماتحت اور چیلے حیران تھے۔ لیکن علی بہادر نے یہی ترکیب سوچ نکالی تھی کہ خود ”صاحب“ کہہ اٹھے گا کہ نئی چیزیں اس قابل نہیں ہیں تو وہی بہتر ہیں جن کی آزمائش ہو چکی ہے۔

لیکن صبح علی بہادر کی حیرت کی انتہا نہیں تھی جب کہ صاحب خوش تھا اور کئی راتیں اس نے ”سبھی“ کے ساتھ گزار دیں۔

علی بہادر کے حوصلے بڑھ گئے۔ صاحب کو ادھر کھلی کلیاں پتہ نہیں ہیں اس کو تو شگفتہ پھول چاہئیں۔

کچھ دن بعد صاحب نے اس قسم کے کسی دوپٹے شگفتہ پھول کی پھر فرمائش کی۔ اب کی بار علی بہادر نے جب نئی عورت حاکم کے حوالے کی تو وہ رات بھر خود بھی نہ سو سکا۔

صبح ہوئی تو ”صاحب“ نے کہا۔

”بہادر تم واقعی بہادر ہو۔ کیا بچھری ہوئی شیرنی جنگل سے کپڑا لے کر آئی ہے کہ قابو ہی میں نہ آتی تھی۔ آنسوؤں کا تو خزانہ ہے اس کی آنکھوں میں۔ کہتی تھی تم اسے دھوکا دے کر لاسے ہو۔ بڑی شکل سے قابو میں آئی وہ۔“

علی بہادر بس ہلکے ہانڈہ کر کھڑے سکراتے رہے۔ یہ سکراہٹ فی الوقت تو فاختانہ بالکل نہ تھی، بڑی بدخودارانہ تھی۔

جب حاکم نے کہا کہ۔

علی بہادر! آج رات انہیں پھر لے آنا۔ ۱۱۔

تو علی بہادر بھگڑی کا طرہ بڑے بانجھن کے ساتھ درست کرتے ہوئے بہت ہی فاختانہ انداز سے بد قد پوش عورت کو ساتھ لیکر باہر نکلتے نکلتے رک گئے۔ پھر آہستہ سے قریب ہو کر کہا۔

”اب اس کو ہمیں رکھ بیجئے۔ بڑی ضدی اور پانی کی عورت ہے۔ پتہ

نہیں میری بات اب کبھی ماننے لگی یہ۔ میں بھی نہیں رہوں گا تو آہستہ آہستہ مانوس ہو ہی جائے گی۔“

حاکم نے بڑی رازداری سے پوچھا۔

”پھر اس کے گھر والے؟“

علی بہادر نے صاحب کے اور زیادہ قریب ہوتے ہوئے کہا۔

”آپ اس بات کی فکر نہ کریں۔ اس نے بتایا نہیں آپ کو؟۔ یہ میری

بیوی کا ہے۔“

”صاحب“ نے علی بہادر کی بیٹھ کھونک کر کہا۔

”تم بڑے بہادر ہو، بڑے وفادار۔“

علی بہادر کچڑی کا طرہ بڑے بانگین کے ساتھ درست کرتے ہوئے باہر

نکل گئے تو حاکم کے منتظر کتے ہی لوگوں نے انھیں جھک کر سلام کیا۔

ایک سوال

کپڑے بدل کر کسی کام سے باہر جانے کے لیے نکلا تو کالونی کی نگر پر مجھے زینو
 ن گئی دو وقت۔ رے بیوں تو پتہ نہیں کیوں مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میرا کچھ
 کھو گیا ہے جس کی میں تلاش کر رہا ہوں۔ لیکن یہ احساس چونکہ غیر شعوری طور پر میرے
 ذہن و دل میں رچ بس گیا ہے۔ اس لیے میں ان وقتی اداسیوں سے کچھ مانوس رہتا ہوں
 جن کی شاید کوئی اساس نہیں ہے اور جو دھیرے دھیرے میرا مزاج بگاڑ گئی ہیں۔ اس
 عالم میں زینو مجھے کالونی کی نگر پر مل گئی۔ پہلے تو میں نے اس کے سلام کا جواب سلام سے
 دے دیا اور پھر آگے بڑھ گیا۔ چاہتا تو اس سے میں یہ پوچھ بھی سکتا تھا کہ اندھیرے اجالے
 کے اس سنگم پر۔۔۔ پیل کے گھنے سایوں کے نیچے۔ بھری شام کے وقت، جہاں سہی ہوئی تاریکیوں
 کو شکر مہم روشنی، ابلنے کی ناکام کوشش کر رہا ہے۔ وہ اکیلی کیوں کھڑی ہے۔ اسے کس کا
 انتظار ہے۔

زینونہی تو بلی و لھن ہے۔ اس کا شوہر کسی درکشاپ میں کام کرتا ہے۔ جو رات گئے لوٹتا ہے۔ اور جو میرا دوست ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس کے لیے شام ہمارے زینونہ کے منتظر رہتا ہے۔ کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ زینونہ کی انتظار کی کھڑیاں تو دن ڈھال سوتی ہیں اور رات گئے بیدار ہوتی ہیں۔ لیکن میں نے اس سے کچھ نہیں پوچھا۔ بس چپ چاپ اس کے پاس سے یوں گزر گیا۔ جیسے شادی کی برات کے برائے جنازے کا کوئی بیلوس گزر جاتا ہے۔

اس نے خود مجھے پکارا۔ مبین بھائی۔ میں نے یہ آواز پکڑ اس طرح سنی جیسے کوئی پکار نہیں رہا۔ بلکہ پکارنے کی تمنا کر رہا ہے۔

میں اس کے قریب پہنچی تو اس نے کہا۔۔۔ سجادے اب تک نہیں لوٹا۔ اس کا گلہ رندھا ہوا تھا۔ ہمدردی کا ایک لفظ بھی اس کی آنکھوں میں ٹھہرے ہوئے آنسوؤں کا بستہ توڑ دینے کے لیے کافی تھا۔ مجھے تر و دھنور مہیا۔ لیکن میں نے اسی لیے اپنی پریشانی اس سے چھپالی۔ اور جھوٹ موٹ ہی اس کا مذاق اڑاتا ہوا ہنسنے لگا۔

”تو بھلا اس میں روتے دھوتے کی کیا بات ہے؟“

”تو پھر کیا کروں؟“

”خوب تم لڑکیوں کا جواب نہیں۔ گویا رونا دھونا بھی کچھ کرنے میں داخل ہے۔“ وہ مسکراتے لگی۔ اس کے مسکراتے کا سماں بالکل ایسا تھا جیسے سیپل کے گھٹے سارے میں شکر کی دھم روشنی کا سماں۔

”بولیے نا۔ کیا کروں میں؟“ اس کے رندھے ہوئے گلے کا نمایاں درد۔ اب سوز پنہاں بن رہا تھا۔

”دوسری جنہاں کہاں چلی گئیں؟“ میں نے تفصیلات جاننے کے لیے پوچھا۔

”سب کی سب اڑوس پڑوس میں اسی کو ڈھونڈ رہی ہیں۔“
 ”اور تم یہاں کھڑی ہوئی آنسو زمین میں بوری ہو کر فصل اگے تو کاٹ سکو۔“
 ”انٹرمین بھائی۔ کچھ کیجئے نا۔“

”دہ اسکول گیا تھا آج؟۔ میں نے اس طرح جرح کی جیسے لمحہ بھر میں اسے لاکھڑا کر دوں گا۔“
 ”جی ہاں گیا تھا۔ لیکن اب تک نہیں لوٹا۔“ دہ پھر رو پڑنے کو لگتی۔

اس کے لیے یہ چھوٹا سا حادثہ یقیناً تشویشناک تھا۔ مجھے اس سے ہمدردی تھی۔ میں نے اس کے دکھ کو پوری شدت سے محسوس بھی کیا تھا۔ سجاد سے اس کا اکلوتا، چھوٹا اور چیتا بھائی تھا۔ دہ عمر کی اس منزل میں تھا۔ جہاں ایک بھول، ایک غلط قدم زندگی بھر کا حاصل ہو کر مستقل کا مقدر بن جاتا ہے۔ سجاد سے ویسے مجھے بھی پیارا تھا۔ میرے اس تعلق خاطر کے دو سبب تھے۔ ایک تو یہی کہ یہ بارہ تیرہ سالہ سا لڑکا، سلونا لڑکا نظر بڑا نیک تھا۔ اس کے سر سے زمانے کی ہوا کے دھبھونکے ابھی نہیں گزرے تھے۔ جو اس عمر کے لڑکوں کو اسکول سے اٹھا کر گلی کوچوں میں لے آتے ہیں۔ پھر بڑی بڑی سڑکیں اور شاہراہیں اس کی ہمدم دھمازا بن جاتی ہیں۔ اور گھر میں ان کا بھی نہیں لگتا۔ دوسری ایک جذباتی وابستگی جس بنا پر وہ مجھے اچھا لگتا تھا۔ علاوہ ازیں یہ تھی کہ میرے اپنے بچے کا وہ کبھی بڑا گہرا دوست بھی تھا۔ آج میرا کچھ بھی اس دنیا میں ہوتا تو یہ دوستی آج تک قائم رہتی۔ شاید وہ بھی تیرہ کے دکھ درد کا کچھ مداوا کر سکتا اور اپنے دوست کی تلاش میں اپنے ننھے ننھے سے دھڑکتے ہوئے دل کو لیے لیے سرگردان رہتا لیکن اس کا دل تو بس کھیلتے کھیلتے ہی ٹھہر گیا تھا اور وہ مجھ سے، اپنی مٹی سے، اپنی بہن اور بھائیوں سے کچھ بھی نہ ملنے کے لیے جدا ہو گیا تھا۔ اور اس کے بعد میں آج تک اسے نہیں پکارا ہوں کہ منیر شاہ ہو گئی ہے گھر لوٹ آؤ۔

آج زینو نے سجادے کے گھر نہ لوٹنے کی بات اس ڈھنگ سے کی کہ میں تڑپاٹھا۔ جی چاہا، اس سے پوچھوں کہ بچگی آنسوؤں کی فصل میں اگی ہے جو اگے گی۔ سجادے تو صبح کا بھولا ہے جو شام کو گھر لوٹے گا ہی۔ میرا سینہ تو شام کو اس طرح گھر سے چلا گیا کہ پھر اس کی صبح ہوئی نہ میری۔ زندگی اس کا منہ تنگ رہ گئی اور موت میرا۔ سنتا ہوں کہ وقت نہیں ٹھہرتا ہے۔ لیکن میں نے سینہ کی جدائی کی وہ ایک شام یا تو کپڑا اپنے سینے میں چھپالی ہے یا پھر وقت ٹھہر گیا ہے۔ لیکن میں نے زینو سے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ بھلا ہر وہ بات جو دل کے زخموں کو کید کر رکھ دے کسی سے کیسے کہی جاسکتی ہے اور پھر آدمی کا دل دکھا ہوا ہو تو وہ دوسروں کے غم بھی اپنا لیتا ہے۔ لیکن میں تو اپنے دکھ درد کا موازنہ اس کے غم سے کرنے چلا تھا۔ یہ کسی خود غرضی ہے۔ کتنا جھوٹا ہی ہے۔ اس کے باوجود میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں بھی زندگی میں ایک بار صرف ایک بار پکار سکوں کہ "مینہ و شام ہو گئی ہے تم بھی گھر لوٹ آؤ" میں نے زینو کو قسمی دی۔ تم گھر چلی جاؤ۔ سجادے آ جائے گا وہ کہاں نہیں جاسکتا۔ یہ اس کی فطرت کے خلاف ہے۔

سجادے رات گئے گھر لوٹ آیا۔ زینو کا گھر میرے گھر کے برابر ہی تھا۔ مجھے رات ہی اس کے لوٹنے کی اطلاع مل گئی۔ جی چاہا سجادے سے دل کھول کر باتیں کر دوں۔ اس سے پوچھوں کہ اس کے پھوٹے سے دل پر اس نے تجربے سے کیا گزری۔ وہ گیا کیوں تھا اور آ کیوں گیا۔ وہ کیا بات لکھی جس نے اس کے دل سے اس کی بہنوں کی محبت چھین لی تھی۔ خون کے رشتے اٹوٹ ہوتے ہیں یا نہیں۔ اس کا مجھے علم نہیں۔ میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ دل کے رشتے ضرور اٹوٹ ہوتے ہیں۔

صبح کو نہ اس کے گھر گیا تو چاروں بہنوں میں گھرا ہوا دمٹھن سا بیٹھا تھا۔ سب کی سب

اسے نصیحت کر رہی تھیں۔ زینو کی باتوں سے برہنہ نمایاں تھی۔ زینو کا شوہر بھی بیچ بچ ہیں
 سجادے کو دھمکا رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اب اگر سجادے اسکول سے سیدھے گھر نہیں آئیگا
 تو پولیس میں اس کے خلاف رپورٹ لکھوا دی جائے گی۔ سجادے کی دوہنیں کھڑک بیدہ
 سی تھیں۔ پھر تجھے دیکھ کر جیسے ان کے آنسوؤں کو بہہ لینے کا سہارا مل گیا۔ اپنے
 مرحوم ماں باپ کو یاد کر کے وہ رو پڑیں۔ زینو نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اچھا ہی ہوا
 جو اب، امی اس دنیا سے اٹھ گئے۔ وہ سجادے کے یہ سب کروت دیکھتے تو اپنی موت نہ مانتے
 بھلا ۹۹

میں نے آپ کو کہانا۔ کہ سجادے تو بہت پیارا سا لڑکا ہے اس کے سر سے زمانے
 کی ہوا کے وہ بھونکے ابھی نہیں گزرے ہیں جو اسے اسکول سے اٹھا کر گلی کو چوں میں لے آتے
 لیکن وہ اپنی بہنوں کی اس اداسی سے ان کی برہنہ سے، غرض کہ ان کے ہر رد عمل سے اس
 طرح بے نیاز تھا۔ جیسے اس نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی، جو اس کی اپنی دانست میں اس کا
 سر جھکا سکتی تھی۔ مجھے سجادے کی یہ بے نیازی ہی تو کھل گئی۔ کچھ ایسا محسوس ہوا کہ اس کے
 سر سے زمانے کی ہوا کے وہ بھونکے گزر گئے ہیں۔ جو اسے اسکول سے اٹھا کر کوچوں میں لے جا رہے
 ہیں اور اب سجادے زینو کے بس کا روگ نہیں رہا ہے۔

زینو اپنی چھوٹی بہنوں اور سجادے کی صرف بہن ہی نہیں تھی۔ وہ تو ان کی ماں
 بھی تھی۔ اور باپ بھی۔ اس نے خود پڑھا، اپنی تعلیم ہی کے دوران میں ٹیوشن کر کے اتنا
 کمایا کہ سب بہنوں کی کفیل ہوئی۔ سجادے تو اس کا راجہ بھیا تھا۔ راجہ بھیا کو تو اس نے
 بڑھ چڑھ کر ہی چاہا۔ راجہ بھیا کے توبیں اللہ تبارک تھے۔ لیکن یہ ساری محبتیں، چادر کی
 گنجائش میں سمٹی ہوئی تھیں۔ محبت کی رعیت لا محمد و سہی۔ محبت کی دنیا کا اور پھر نہیں

لیکن محبت کے امکا نامہ بڑے سکرانے سمیٹے ہوئے ہیں محبت کا کوئل پودا تو دل کے ٹوٹنے سے
 لے کر ردی کے نہ ملنے کا، یکساں طور پر مر چکا جاتا ہے۔ — زینو کی چادریں محبت کی وسعتیں
 ست آئی تھیں۔ لیکن زمانے نے جوار اور گیہوں کے خوشے چادر کے دامن سے چرایسے کھتے
 میں بھانپ گیا تھا کہ زینو کی ہی تھی دامن پیار کے نرم دنا زک پودے کو غیر محسوس
 طور پر کھلانے کا باعث بن رہی تھی۔ نہ سجادے کا اس میں کوئی دوش تھا۔ نہ زینو کا۔ دونوں
 مجبور تھے۔ دونوں نردوش۔

میں نے جس طوفان کی آمد کد سے آہٹ پالی تھی، اب وہ طوفان تو میری نظروں کے سامنے تھا۔
 میں سن چکا تھا کہ زینو کے شوہر نے اسکو کی نوکری سے بھی زینو کو منع کر دیا تھا۔ اور
 اس نے یہ نوکری پھوڑ بھی دی تھی۔ — زینو کا شوہر چاہتا تھا کہ زینو جیسے اس کے گھر کی بہار
 بن کر آئی ہے تو یہ بہار اس کے اپنے گھر ہی کو چین درچین کر دے۔ زینو کے شوہر کا یہ مطالبہ
 غلطی بھی تھا جائز بھی اور زینو نے اپنے گھر کو جنت بنا دینے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی۔ اب
 جب کہ ایک چاہنے والے شوہر کی بیوی بن گئی تھی۔ اب جب کہ وہ ایک گھر کی مالکن بن گئی تھی۔
 اب جب کہ وہ ایک بچے کی ماں بننے والی تھی۔ تو سجادے اس کا چہیتا ہونے کے باوجود بھی نہ
 اس کا حاصل زندگئی تھا۔ نہ مرکز نگاہ۔ — اب تو زینو محبت ہی محبت بن کر سب
 میں تقسیم ہوتی پھر رہی تھی۔

ایک دن تھا، سو اس میں، اس کا شوہر، اس کا گھر، اس کا ہونے والا بچہ، اس کی بہنیں،
 اس کا سجادے، سب سب اس طرح بے صبری سے داخل ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔
 جیسے تنگ گلی میں کسی پھرے ہوئے جلوس کے بلوائی داخل ہوتے ہوں۔ — اور زینو ہر ایک
 کے آگے اپنا دل کھول کھول کر رکھ رہی تھی۔ اس نے اپنے دل کا دروازہ کھلی کھول دیا

اس نے دل کی بات مان لیتے ہیں پس دیش سے کام لیا — دل نے پھر کہا۔
سجادے اپنا بار آپ اٹھا لو۔

اور جب سجادے نے اپنا بار آپ اٹھا لیا تو کالونی کی ٹکڑ پر مجھے زینوں گئی —
چاہتا تو میں زینوں سے پوچھ بھی سکتا تھا کہ اندھیرے اجالے کے اس سنگم پر — پیپل کے گھنے
سیالوں کے نیچے، بھری شام کے وقت جہاں مٹی ہوئی ٹارکیوں کو سڑک کی مدھم روشنی، اجالنے
کی ناکام کوشش کر رہی ہے۔ وہ اکیلی کیوں کھڑی ہے۔ اسے کس کا انتظار ہے۔

لیکن میں نے اس سے کوئی ایسی بات نہیں پوچھی — سجادے لوٹ آیا تو زینوں نے
مجھے خود بتایا کہ سجادے نے کسی ایرانی کے بڑے سے ہوٹل میں ملازمت کر لی ہے۔ اور
اب وہ اسکوئی سے سیدھا اسی ہوٹل کو جایا کرے گا۔ جہاں رات گئے ایک دوپہ تک اسے
کام کرنا ہے۔

زینو مجھ سے کہنے لگی — اب آپ ہی سمجھائیے نامتین بھائی سجادے کو — وہ
نوکتا ہے کہ نوکری چھوڑ دینے کے لیے میں جبر کر دوں گی تو وہ گھر ہی سے کہیں چلا جائے گا۔
اور زینو کی آنکھیں زمین میں آنسو بونے سے بے تیار کھڑی تھیں۔

میں نے سجادے کو نظر بھر کر دیکھا — اس کے چہرے پر ارادے اور عزم کی سرخیاں
تھیں شفقت کی ایسی سرخیاں جو نمود و سحر کا پتہ دیتی ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ سجادے نے اندھیرے کی طرف
نہیں اچالے کی جانب قدم اٹھایا ہے، اور ایسے میں اسے نہیں روک سکتا ہوں نہ زینو۔
اور ہوا بھی یہی — میں اور نہ تو بار گئے تھے۔ سجادے کی جیت ہوئی ملتی — اور اس نے
وہی ملازمت جاری رکھی۔

لیکن اپنی منزل کی جاسٹ پڑھنے والا یہ تنہا اور اکیلا راہی سجادے بھی ایک شام کالونی

کے اسی موڑ پر ادا اس اور رول کھڑا مجھے نظر آیا۔ جہاں کبھی زینو اسی عالم میں کھڑی ملی تھی۔

میں اس کے پاس گیا۔ اس سے بہت قریب ہو کر میں نے اس سے پوچھا۔
 ”کیا بات ہے سجادے؟“

سجادے کی چپ نے مجھے اصرار کرنے پر مائل کیا۔ میں نے یہ اصرار اس سے پوچھا۔
 — کچھ بتاؤ بھی سجادے شاید میں کچھ کر سکوں۔

سجادے نے بتایا کہ آج ہوٹل کے کام سے پھٹی کا دن ہے لیکن کالونی کے لڑکے
 جن کا وہ کبھی بہت پیارا دوست تھا آج اس کے ساتھ کھیلنے سے گریز کر رہے ہیں۔
 اس نے بڑے درد پھرے لہجے میں مجھ سے کہا۔

دیکھیے وہ سب مجھے ہوٹل کا چھوٹا پکار رہے ہیں میں نے تو اپنا بار آپ اٹھایا
 تھا۔ میں نے کوئی بُرائی تو نہیں کی تھی۔ لیکن وہ مجھ سے کھیلنا تک گوارا نہیں کرتے۔
 ان کے بڑوں نے انھیں منع کر دیا ہے۔ بتائیے نا اب میں کیا کروں۔ میں کہاں
 جاؤں۔ کئی سے کھیلوں۔

میرے بدن میں جیسے لادکی ایک بوند بھی اس وقت نہیں تھی۔
 میرا ذہن جس پر ابھی اُلھی بکلی گری ہے۔ یہ سوچ رہا ہے کہ میں سجادے کو کوئی جواب دوں۔
 لیکن کوئی جواب مجھے سمجھائی نہیں دے رہا ہے۔

آپ سجادے میں سجادے کو کیا جواب دوں؟ — وہ منتظر ہے۔
 میں اس کا علم کس طرح بانٹ لوں۔

سنگ آستان

قلب شہر میں واقع اس عمارت کا ماضی بھی بڑا شاندار ہے۔ دورِ محال بھی۔
 پچھلے دنوں میں داخل ہوتے ہی بڑا حائل کے نیچوں بیچ بیضوی دھن کا بہت بڑا حوض ہو
 صحر کے درمیان ایک فوارہ ہے اور اپنے شفاف پانی اور رنگ برنگی ٹھیلوں کے لیے
 مشہور ہو گیا ہے۔ حوض کے اطراف نرم و نازک ٹودتا زہ ہریالی پر کم سے کم سو
 کرسیاں بچھائی جاسکتی ہیں۔

اس کے بعد سیر لھیاں ہیں جو آپ کو عمارت کے دامن میں لے جاتی ہیں۔ دامن عمارت
 کا حصہ اور بھی زیادہ دل نبھانے والا، اور بھی زیادہ پرکشش ہے۔ ہمارے کی ترانی کی طرح
 دامن کوہ میں جو رنگینیاں بکھری ہوئی ہیں وہ ساری رنگینیاں کچھ زیادہ ہی اہتمام سے
 اس بلند عمارت کے اطراف سمیٹی گئی ہیں جو سطح زمین سے بلندی پر واقع ہے۔

سیر لھیاں چڑھنے کے بعد یہی جانب تراشی ہوئی باڑھ کے جھبے بنے ہوئے ہیں

جو تعداد میں پانچ ہیں۔ ان کے مقابل رنگارنگ پھولوں کی چھوٹی چھوٹی کاریاں ہیں۔
 کاریوں کے اطراف سیمنٹ کے بنے ہوئے گنگے ہیں اور پھر اسی ہریالی کا سلسلہ ہے جس کے درمیان میں
 سرو کے درخت ہیں۔ اس ہریالی کے دو حصوں کو بانس کے جال سے گھیرا گیا ہے اور یہ جال
 اس حد تک حسین ہیں کہ بانس کا ایسا دلکش طریقہ استعمال میں نے کم ہی دیکھا ہو گا۔ ایک ہی
 گولائی کے تراشے ہوئے بانس ہر چھ انچ کے فاصلے پر زمین میں پیوست کر دیے گئے ہیں
 اور ان پر دھلتا ہوا رنگ اور پھلکتا ہوا سفیدہ اس طرح پھیرا گیا ہے کہ ایک بانس ہر ایک
 ایک بانس سفید اور سفید و سبز کا یہی سلسلہ ہریالی کی پشت پر پھیلا ہوا ہے۔

سیڑھیوں کے بائیں جانب چوتھے کے وسیع حصے سفید محراب — چینی
 کافر ش ہے اور دوسرے نصف حصے پر بالکل سرخ چینی کا۔ آپ ایک نظر میں ان دونوں
 وسیع حصوں پر بکھری ہوئی بینت کی سفید اور سرخ کاریاں اور میزیں دیکھ سکتے ہیں۔
 جو نظروں کو بے اندازہ کھلی معلوم ہوتی ہیں۔ سفید چینی کے وسیع حصے پر سرخ میزیں اور
 کاریاں اور سرخ چینی کے نصف حصے پر سفید میزیں اور کاریاں۔ ان دونوں سفید
 اور سرخ حصوں پر گوشہ ابلق اور گوشہ اتر کی سنگ مرمر کی تختیاں لپٹے کے خوبصورت
 سے اسٹینڈ پر لگی ہوئی ہیں جو بالترتیب سفید اور سرخ ہیں۔ لیکن اب انھیں ان ناموں سے
 کوئی نہیں پکارتا بلکہ یہ ’وہائٹ کارٹر‘ اور ’ریڈ کارٹر‘ کے نام سے مشہور ہے۔

’وہائٹ کارٹر‘ اور ’ریڈ کارٹر‘ کے دلدادہ لگاں — شام ہوتے ہی
 اپنے اپنے دکار ترسنبھال لیتے ہیں لیکن جنھیں ہریالی پسند ہے ان میں بھی تفریق اس طرح ہے کہ
 وہ اگل جنھیں ہریالی اور سرو کے لمبے لمبے درخت پسند ہیں وہ سیڑھیاں چڑھ کر بنی پر بکھی
 ہوئی ہریالی پر بیٹھتے ہیں اور وہ لوگ جنھیں ہریالی پر فواروں کی رم جھم اور پلکارے لیتے

ہوئے پانی میں تھرتھرتی ہوئی پھلیاں پسند ہیں وہ پھلی ہریالی ہی پر بیٹھ رہتے ہیں۔

اس کے بعد شیشے لگے ہوئے بڑے بڑے 'اسپرنگ' کے دروازوں کو کھول کر آپ کو عمارت میں داخل ہونا پڑتا ہے آپ کے عمارت میں داخل ہونے کے بعد 'اسپرنگ' لگا شیشے کا دروازہ جیسے سرت میں بھومتا رہتا ہے۔ عمارت میں داخل ہوتے ہی آپ کا پہلا قدم ایران کے اس قالین پر پڑتا ہے جس پر پاؤں رکھتے ہی آپ کے آدھے آدھے جوتے قالین میں چھپ جاتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے رنگارنگ تازہ و فرحت بخش پھول فرش پر تہہ در تہہ بکھیر دیے گئے ہیں اور آپ انہیں روند کر گزر رہے ہیں شبہہ ہوتا ہے کہ روند ہوئے ان پھولوں میں یہ شگفتگی اور تازگی کس طرح ہے۔

یہ ایک بہت بڑا وسیع ہال ہے جس میں آپ کم کم روشنیوں اور مدھم مدھم روشنیوں کی مدد سے داخل ہوتے ہیں۔ بڑی رومانی فضا یہاں پیدا کی گئی ہے۔ روشنیوں کے اہتمام میں حالیہ ٹیکنک کو استعمال کیا گیا ہے کہ چھت کو حسین نقش و نگار سے مزین کر کے روشنیاں 'یٹوب' لائٹ کی مدد سے پھیلا دی گئی ہے، لیکن اس طرح کے چھت میں چھپی ہوئی 'یٹوب' لائٹیں نہیں بالکل نظر نہیں آتی ہیں۔ صرف روشنیاں بکھر جاتی ہیں وہ لمبی کم کم 'مدھم مدھم'۔ چھت کے بچوں بیچ جو حصہ ہے اس کے اطراف ستونوں میں گولے چھپا دیے گئے ہیں جو سلگتے ہیں تو چھت پر ٹکے ہوئے ستاروں، آسمانی ستاروں کی طرح جھلکاتے لگتے ہیں۔ ایسے میں ہال کے اندر پھیلی ہوئی دوسری روشنیاں یا تو گل کر دی جاتی ہیں یا کم کر دی جاتی ہیں تاکہ درمیانی حصے کا حسن اور نکھر سکے اور ابھر سکے۔

قالین پر بکھرے ہوئے صوفے بڑے نرم اور بڑے دیدہ زیب ہیں جو دیواروں کی جانب پشت کر کے رکھے گئے ہیں اور جن کی سادگی ہی ان کا حسن ہے۔ ان کے آگے میزیں پڑی ہیں

ان کے آگے میزیں پڑی ہیں اور ان کے مقابل گدے کی نرم کرسیاں جن کی وضع دائرہ نما ہے۔
 شہر کے اس سب سے خوبصورت اور شاندار ریٹورال اور بار سے آفتاب احمد
 ایم۔ اے کا بڑا گھر تعلق ہے۔ اس عظیم عمارت کی بنیادیں زمین میں جتنی گہری ہیں، اتنی ہی
 آفتاب احمد کی زندگی میں پیوست ہو گئی ہیں۔ رکاسی، آفتاب احمد کی زندگی میں تیس سال
 قبل اپنی خواب گوں فضاؤں سمیت پھر اس طرح داخل ہو گئی تھی جیسے کوئی انجان دوشیزہ کھون
 کے راستے دل میں داخل ہوتی ہے۔ اس وقت آفتاب احمد تیس سال کا دبلا پتلا اور چھریرا
 ماصحت مند فوجوان تھا۔ کالج کی زندگی تھی، بے فکری کے دن تھے۔ اس کی زندگی دنیا کے وسیع
 کارخانے سے ابھی اس طرح وابستہ نہیں ہوئی تھی کہ اس کے تصوروں کی دنیا تسخیر ہو جاتی۔
 ابھی بری کتا ہیں پڑھنا، بحث کرنا، دوستوں کی محفلوں میں خوش ہونا اور انھیں خوش کرنا بس
 یہی باتیں حاصل زندگی تھیں۔

کالج کے ساتھیوں میں محروم سے آفتاب کی بہت گہری بھینتی تھی۔ ان کے ایک دوست
 نے کسی امتحان میں کامیابی حاصل کی تو محروم اور آفتاب نے صاف صاف کہہ دیا کہ رکاسی
 میں دعوت ہوئی چاہیے۔ رکاسی میں دعوت ملے ہوئی۔ تینوں مل کر دھڑکتے دل سے
 رکاسی پہنچے۔ جذبہ شوق کی فرادانی۔۔۔ اور تازہ تجربوں کے اشتیاق نے ان کو
 میں خون کی روانی کو خود ہی تیز کر دیا تھا۔ اس پر کبھی بھاپ بیر کا آرڈر دیا گیا۔ ان دنوں
 ’بکس‘ بیر کی قیمت دس بارہ آنے فی بوتل تھی۔ بیراتین بوتل بیر لے آیا تو دیکھتے ہی ان
 تینوں دوستوں کے ہوش بجا نہ رہے۔

تینوں نے ایک دوسرے کو گھنٹیوں سے دیکھا، نظروں نظروں میں باتیں ہوتیں اور دو
 بوتل واپس کرنے کا حکم فوری دے دیا گیا۔ بیرا مسکرانے لگا۔ وہ تارڑ گیا تھا کہ اس کو چہ میں پہنچا

ان فوج افروں نے قدم رکھا ہے اور سمجھ رہے ہیں کہ ایک بوتل بیرتینوں پر اتنا اثر کرے گی کہ کھجوتے کھجوتے بدست لڑیں گے۔

بیرا کو سکراتا ہوا دیکھ کر تینوں مسکرائے لگے جیسے اس کی سکر اہٹ میں ان کی اپنی سکر اہٹ بھی چھپی ہوئی تھی۔ جب بیرتینوں گلاسوں میں تقسیم کر کے پیرا جلا گیا تو ان لوگوں نے اپنے جام اٹھا کر ٹکرائے اور ادھر ادھر دیکھ کر ہر ایک نے چمکی لی۔

”یارسہ تو کچھ عجیب کوڑی کیسلی سی ہے“ آفتاب احمد نے کہا۔ دوسروں نے منہ بنا کر گویا اس بات کی تصدیق اور تائید کی۔ لیکن اب کیا کیا جاسکتا تھا۔ مزہ تو اب ان لوگوں نے چکھ لیا تھا جو بڑا ناپسندیدہ ثابت ہوا۔ اب بے دے کر اس کا اثر دیکھنا تھا۔ بیسویں تیوں کر کے اپنے گلاس خالی کیے لیکن انھیں اپنی کیفیت میں کوئی تبدیلی محسوس نہ ہوئی۔ اس نئے تجربے کو اتنا بے اثر اور فضول مان لینے کے لیے ان کا ہی نہ چاہتا تھا۔ پی پی تھی تو ان کا تقاضا تھا کہ کچھ محسوس بھی کریں لوگ تو کسی کسی باتیں کرتے تھے۔ تینوں نے مشورہ کیا کہ اب سیدھے سیدھے کھانے کے کچھ اچھی چیزیں منگوائی چاہیے اور بس۔

میزبان دوست نے بیرا کو پکارا تو محروم نے کہا، ”آواز میں بڑا لویا آگیا ہے، شاید یہ اسی کا اثر ہے“ آفتاب احمد نے کہا کہ ”چراغ زیادہ روشن معلوم ہو رہے ہیں اور شاؤڈ زیادہ گہرے“ پھر تینوں مل کر ہنسنے لگے۔ معلوم تو کیا خاک ہو رہا تھا، بس تینوں کی یہ خواہش تھی کہ ایسی کوئی بات ہوتی جو انھوں نے سنی تھی۔

پر تکلف کھانا کھانے کے بعد جب ان تینوں دوستوں نے رکاسی کو چھوڑا تو آفتاب احمد دل ہی دل میں رکاسی کا ہونچکا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ رکاسی نہیں تھی جس کی مشہور کمی دفعتاً کی تفصیل آپ پڑھ چکے ہیں۔ تیس سال پہلے کے رکاسی میں بیضوی بڑا حوض تھا، لیکن وہ خشک

بڑا رہتا تھا اور اس کے اطراف ہریالی کی بجائے کانٹے دار لوتھ کے تار تھے جو اس کو مخصوص کیے ہوئے تھے۔ سیڑھیاں چڑھ کر بندی پر پہنچنے کے بعد سیدھی جانب سرسبز باڑھ کے حجرے تھے جس کی باڑھ کو ہیاں تراشا تک نہیں جاتا تھا۔ سرد کے سایوں والی ہریالی کی بجائے بس ایک چبوترانا کھلی ہوئی زمین تھی اور بائیں جانب بھی نہ گوشہ ابلق تھا نہ گوشہ انہر جو بعد میں ڈھانٹ کارنر اور ریڈ کارنر کے نام سے مشہور ہوا بلکہ ایک مسطح بڑا سا چبوترہ جس کے اطراف ہری باڑھ لگی ہوئی تھی اور جس پر کرسیاں کچی رہتیں۔ تین سال پہلے رکاسی کی عمارت میں داخل ہونے پر نہ آپکے پیچھے 'اسپرنگ' کے دروازے درختی سے بھروسے نہ کچے پتھروں کو رد کرنے کا احساس کسی قانون پر پیر رکھنے سے ہوتا تھا، نہ بڑے ہال کی وہ کم کم اور مدھم مدھم روشنیاں تھیں، نہ چھت کے وہ نقش و نگار تھے، نہ رنگوں کے امتزاج سے یہ سماں بنتا تھا، نہ ستارے آسمان سے اتر کر چھت پر آتے تھے۔ بس ایک سیدھا سا داہنت بڑا ہال تھا جس میں لکڑی کے ادوں سے علاحدہ علاحدہ آرضی کمرے بنا دیے گئے تھے جن میں روغن چڑھی ہوئی بینت کی کرسیاں اور میز بڑی تھیں۔ ہال کا ایک پورا نصف حصہ جو بڑے بڑے ستونوں کے دس طرف تھا رکاسی کے منتظمین کے قبضے و تصرف میں تھا۔

ہال کو دو حصوں میں اس طرح تقسیم کیا گیا تھا کہ اس کے بچوں بیچ جو بڑے بڑے ستون تھے ان سے ملحق الماریاں رکھ دی گئی تھیں جن میں مختلف قسموں کی مشربوں کی بوتلیں، گوشت، مچھلی بنانے اور جام کے ٹپ، پنیر اور مکھن جانے اور کافی کے پیکٹ اور مختلف کھانے کی چیزیں دھری رہتیں۔ یہ الماریاں ستونوں کی مدد سے گویا ہال کو دو حصوں میں تقسیم کرتیں اس طرح پچھلا حصہ رکاسی کے منتظمین کے لیے مختص ہوتا اور یہی رکاسی کے تقریباً تیس سال تک کمرہ بیڑا اسی حالت میں آفتاب احمد کا رفیق رہا ہے۔

لیکن آج رکاسی کا یہی بل اپنی حیثیت بدل کر کیا سے کیا معلوم ہونے لگا ہے۔ نہ وہ لکڑی کی ادٹ ہیں نہ وہ روغن چڑھی کرسیاں، نہ وہ بڑی بڑی الماریاں منتقلین کو گاہکوں سے علاحدہ کرتی تھیں اور جو رات گئے پرانے اور خاص خاص گاہکوں کے لئے جاوینا ہنسی تھیں۔ اس طرح کہ بازار کا وقت ختم ہو جائے پھر بھی منتقلین کسی کو جس پر وہ مہربان رہتے، ان الماریوں کے پیچھے چھپا کر شراب دیتے تھے۔

آفتاب احمد کی کتنی ہی یادیں اس حال سے وابستہ تھیں، جس نے آج بولا بدل لیا ہے اس کا ماضی جیسے اس بل میں بلکہ رکاسی کے چپے چپے میں آج تک کوئی چیز تلاش کرتا پھر تاپے: لیکن آج رکاسی تو اس طرح سچ و سچ کہ اس قدر رعنائیاں اپنے دامن میں سمیٹ کر آفتاب احمد کے سامنے کھڑی ہے کہ اس کی آنکھیں چونڈھیا گئی ہیں، وہ بلیں جھپک جھپک کر ان نئے اجالوں سے کھو کو مایوس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

آپ جان چکے ہیں کہ آفتاب احمد آج سے تیس سال قبل پہلی بار رکاسی سے متعارف ہوا تھا جب کہ اس کے ایک دوست سے کامیابی کی خوشی میں اس نے پارٹی، دی تھی۔ جائزہ لیں اس کو رکاسی کی وہ فضا میں پسند آئیں جن میں آدمی اپنی زندگی بھر کی تنہائیوں کو ساتھ لا کر بھی بہل جاتا ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ رکاسی کی باڑھ میں سسکتی ہوئی ہوا کے بھونکوں میں ایک ایسی کیفیت ہے جو آدمی کے سینے میں دھیمی دھیمی آہنج بھی لگاتی ہے، اس کو ہوا بھی دیتی ہے۔ اتنی بڑی عمارت کے اطراف پھیلے ہوئے اتنے وسیع احاطے میں کہیں کیس دو چار گولے اس طرح جلتے تھے جیسے افسانی دکھ درد کو نگار کرنا چاہتے ہوں۔ وہ نہ کھنی فضا میں چبوترہوں پر بکھری ہوئی روغن کی سیوں پر افسانوں کے دھڑکتے ہوئے دل اور ان دلوں کی مختلف کیفیت کو حاضر کرتے ہوئے بہرے بالکل عیاں اور عریاں ہو کر ایک دوسرے کے مقابل ہو جاتے اگر یہ روشنیاں تیز ہوں۔

رکاسی کی فضاؤں پر ایسی ہوتی ہوئی خاموشی، ایک ایسی آباد ویرانی کا گمان ہوتا جس کا تعلق صرف عالم محسوسات سے ہوتا ہے اور آفتاب احمد اس عالم محسوسات کا دلدادہ اور رسیا تھا جو اس کو رکاسی کے ماحول میں مل گیا تھا۔ وہ ہر دوسرے تیسرے دن چپکے سے دوستوں کی محفلوں سے اٹھ کر رکاسی چلا آتا کبھی کسی گوشے میں بیٹھ کر، لیکن اسکو اش، پتیا، کبھی ٹھنڈی کافی، کبھی گرم چائے، کبھی اس کی جیب بجا زت دیتی تو وہ رات کا کھانا نہیں پرکھالیتا اور گھنٹوں بیٹھا یہاں کے پرسوں ماحول سے سکون پاتا۔

پھر وہ قریب قریب روز نہ آنے لگا، ایسے، اور کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے منجر کیے اب اس کا چہرہ مایوس سا ہو گیا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی شخصیت ہی ان سیکے لے بانوس ہو چلی تھی۔

اپنی شاموں کی خوشیاں، اپنی شاموں کی اداسیاں، اپنی شاموں کا حاصل، اپنے ساتھ لیے وہ برابر رکاسی پہنچ جاتا۔ رکاسی سے اس کی یگانگت بڑھتے بڑھتے ایک بے نام ضرورت میں تبدیل ہو گئی۔ پھر یہی ضرورت لگاؤ اور انس تک جا پہنچی اور ہوتے ہوتے آفتاب احمد کی زندگی میں رکاسی اس طرح داخل ہوئی کہ اس کی شاموں کی ساتھ بن گئی۔ دن مہینوں میں تبدیل ہوئے، مہینے برسوں میں۔ "انٹر میجیٹ" کا طالب علم اب آفتاب احمد ایم۔ اے ہو چکا تھا۔ کتنی ہی نئی دوستیاں رکاسی کے پرسکون ماحول میں پروان چڑھیں کتنی ہی پرانی محفلیں اور دوستیاں رکاسی سے اس کے تعلق خاطر کے سبب آفتاب احمد کو بچہ چکیں۔ اس کے زمانہ طالب علمی کے دو چار دوست اس کو رکاسی میں پھرے۔ دوستوں کی تجویز ہوئی لیکن اس کے دھانگے کے بن بھن کچھ اور استوار نہ ہو سکے۔ کوئی نوکری پا کر صلے پر چلا گیا، کوئی شادی کر کے گھر کا ہو رہا۔ آفتاب احمد جانے والوں کی یادوں کو دل میں چھپا کر

آہستہ آہستہ پھرتا رہا اور آنے والوں کے لیے دوستی کا ہاتھ بڑھاتا رہا، یہاں تک کہ پوری ایک نسل جو اس کی ساتھی تھی اس کے سامنے بوڑھی ہو گئی۔ اس نے عمر کے فرق کو محسوس کیے بغیر نئی نسل کے نوجوانوں کو دوست بنا کر انھیں نوازا اور جو کچھ انکا دکا اس کے اپنے ہم عمر، اسکی اپنی زندگی کی راہوں پر کہیں کہیں مل جاتے تھے ان سے دوستی نبھائی۔ وہ نہ کسی کی قبر پر دریا جلانے کا قائل تھا نہ کسی عرس میں ردھنیاں گل کرتے کا۔ غم ملتے تو وہ انھیں پیار کر لیتا خوشیاں ملتیں تو وہ انھیں چوم کر چھوڑ دیتا۔ نہ دے اس کے دل میں جاگزیں ہوتے نہ یہ اس کے دل میں رنج میں جاتیں۔ جو مل گیا سو اس کا، جو چھوٹ گیا سو اس کا نہیں۔ پانے اور کھونے کے درمیان اس نے ایک ایسا سمجھوتہ کر رکھا تھا جو نہ غم کو غم بننے دیتا، نہ خوشی کو خوشی وہ تو زندگی کی کڑی دھوپ میں ننگے سر چل پڑا تھا۔ سائے دار درخت ملا تو سستایا، بگئے اٹھ یا چکر چلے تو کمر اکر نکل جانے کی کوشش میں کھلبلیں گیا۔ ٹھنڈی پچھاں میں گھڑی دو گھڑی بھی دم لینا بھی گوارا، جھیل میدان میں لو کے پھیرے بھی منظور۔

آفتاب احمد ایم۔ اے کی متوازن شخصیت اس کے تحمل، اس کی بردباری اور سنجیدگی کے باعث بڑی سمجھ ہو گئی ہے۔ بائیس چوبیس سال کے نوجوان دوست اس کو آفتاب بھائی کہہ کر اس کی دوستی پر فخر کرتے ہیں اور اس کے ہم عمر ساتھی پران یا دوں کو تازہ کرنے کے لیے اس کو گالی دے کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اس کو آفتاب بھائی میں بھی سلوک ملتا ہوتا ہے آفتاب احمد ایم۔ اے میں بھی گالی میں بھی۔ رکاسی میں بیچ کر اس نے ققہوی کاموا گت بھی سکراہٹوں سے کیا، سکراہٹوں کی پذیرائی بھی ہلکی ہلکی مسکاتے سے کی ہے۔

اس کی شخصیت کا مزاج رکاسی کی آباد دیرانی میں شاید اس لیے بارپا تا ہے کہ اس کو رکاسی کی بیرونی دنیا اپنی اندرونی دنیا کے عین مطابق محسوس ہوتی ہے۔

’لیس اسکواش‘ ٹھنڈی کافی اور گرم چائے سے جب وہ بہن نہ سکا تو اس نے دھکی کو
 آزمانا چاہا۔ دھکی نے اس کو تھپک کر فوریاں بھی دیں، بھجھوڑ کر بیدار بھی کیا۔ دھکی نے اس کے
 قدیم سے قدم ملا کر زندگی کی کڑی راہوں میں اس کا ساتھ دیا۔ آنکھیں بند کر کے جاگتے مہے
 اور آنکھیں کھول کر سو رہنے کا گروہ جانتا تھا۔ رکاسی اس کی تنہائیوں میں راز و مال بنیں،
 اس کی شاموں کی آئین۔ وہ رکاسی کے ایک ایک گوشے میں گھنٹوں گزار دیتا۔ تیس سال کے
 اس طویل عرصے میں رکاسی کا ایک ایک چپے اس کی تنہائیوں کا ساتھ رہا ہے۔ وہ اپنی تنہائیوں
 و امین دل میں سمیٹ کر رکاسی کے کسی گوشے میں ان کی اک انجمن بجا لینے کے لیے آتا۔ دھکی اس
 انجمن کو سنبھالنے میں مدد دیتی۔ لیکن جب اس کے دوست احباب اس کو تنہا بیٹھا ہوا پا کر اس کے
 ٹیبل پر پودہ رکھ جاتے تو اس انجمن سے اٹھ کر ان میں آملتا، بالکل اس طرح جیسے انھیں کا منتظر تھا۔
 آفتاب احمد ایم۔ اے نے گزنی ٹھہرے داری کے باوجود شادی سے اس لیے گریز
 کیا کہ اس کو کسی بھی انداز کی پابندیاں گوارا نہ تھیں۔ اس کی ریفیقہ حیات تھی تو دن کو اس
 کا اپنا کتب خانہ اور شام اور شب کو رکاسی اور برسات گئے بستر کی ٹنگنیں۔ دوست احباب
 اس کو ’انسائیکلو پیڈیا‘ کے نام سے بھی پکارتے تھے۔ کسی بھی موضوع پر کسی بھی کتاب کا حوالہ
 آپ کر اس سے مل سکتا تھا۔

جب عمر کا ذکر میں حصہ اس نے اپنی کتابوں، دھکی کی بوتلوں اور رکاسی کی آباد ویرانوں
 کی نذر کر دیا تو پھر اس نے کسی تیسرے ہمسفر کی تلاش کو قابل اطمینان نہ سمجھا اور اسی لیے صرف
 اس نے شادی نہیں کی بلکہ بہت جلد ہی نوکری بھی چھوڑ دی۔

کتب خانہ سے نکل کر وہ ’شیو‘ کرتا، جی بھر کر ٹنڈے پانی سے نہاتا۔ بڑے سیتھے سے
 کچھ سے سمجھتے کپڑے پہن کر پہل قدمی کرتا، ’لیس اسٹینڈ‘ تک پہنچ جاتا اور سات سارے رات

تک گھومتا پھرتا، رکاسی کے احاطے میں داخل ہو جاتا۔

رکاسی، اس کے پیرے، اس کا بیٹھرا، جیسے رجب سبیل کے منتظر رہتے۔ منکراہٹوں کے تبادلے اور پیام اور سلام کے بعد وہ کسی گوشہ عافیت میں پناہ لیتا اور رکاسی اپنی ہلکی ہلکی روشنیوں کے ساتھ اس طرح نیم خوابیدہ عالم میں بیدار ہوتی جیسے اپنے احاطے میں بکھر ہوئے انسانی چہروں پر مدہم روشنیوں کا غارہ چڑھا کر جیلا بخش رہی ہو۔

کبھی کوئی پرانا ساتھی یا جانی دوست اسے مل جاتا اور ایسے میں کسی اندرونی شدید جذبے کے تحت دونوں ہی دیر تک بیٹھے جام پر جام چڑھاتے رہتے اور اس کے باوجود بھی یہ راز نہ ہوتی اور رکاسی کے مدہم جامے آہستہ آہستہ اندھیروں کی آغوش میں سو جاتے، تو وہ اس کو لے کر ان بڑی بڑی الماریوں کے پیچھے بیٹھر کے پاس چلا جاتا، جہاں دوسرے لاکھوں سے چھپا کر اسے مزید شراب دی جاتی۔

کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا کہ بیٹھر الماریوں کی کنجیاں اس کے حوالے کر کے چلا جاتا اور وہ جی چکنے کے بعد بل کی رقم خالی گلاس کے ساتھ الماری میں رکھ کر چابیاں اس مخصوص مقام پر رکھ جاتا جو صرف اس کو اور بیٹھر کو ہی معلوم رہتا۔

رکاسی کی یہ خصوصیات، رکاسی کی یہ اپنائیت، رکاسی کی یہ محبتیں اس کی زندگی کا حاکم بن گئی تھیں۔

اگر کوئی تھا جس کو آفتاب احمد انیم۔ اسے نے چاہا جس کی دلداری کی، جس کے لیے اپنے معاملات میں فرق آنے کو بھی گوارا کیا، تو وہ تھی اس کی ماں۔ اور جب اس کی ماں شدید بیمار ہوئی تو آفتاب احمد جس نے ہوش سبھلنے کے بعد سب سے بچا اس سال کی عمر تک نہ کسی کی تیار دار کی تھی نہ کسی کا دن رات اس طرح سنیاں کیا تھا کہ بس ایک ہی شخصیت مرکز توجہ ہو جائے،

بالکل ہراساں پریشان اور خائف ہو گیا۔ آج تک اس ماں نے ہی اس کے ناز اٹھائے تھے۔ آج تک تو اس کے گھر پر اس کے قدموں کی چاب کا کوئی منتظر تھا تو اس کی ماں تھی اس کے دروازہ کھٹکھٹانے کے خاص انداز پر کوئی بچی نیند سے چونک کر بیدار ہوتا تو وہ اس کی ماں ہوتی۔ اور اس کی ماں کا کوئی بد مقابل نہ تھا، کوئی حریف نہ تھا جو آفتاب احمد اپنی محبت اپنی بیوی، اپنے بچوں اور اپنی ماں میں تقسیم کرتا۔ اس نے آفتاب احمد کو ٹوٹ کر چایا تو آفتاب احمد نے بھی بلا شرکتِ غیرے اپنی محبتیں اس کو سونپ دیں۔

عمر سب سے بڑی بیماری تھی۔ آفتاب احمد جان گیا تھا کہ اب یہ آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں گی جو رات گئے اس کی آہٹ کی منتظر رہتی ہیں۔ اس نے تندہی سے ماں کی تیمارداری اور خدمت کی تقریباً دو ماہ تک وہ بالکل گھر سے باہر نہ نکلا۔ ہر شام اپنے معمول کے مطابق وہ گھر ہی پر پی لیا کرتا۔ ہفتے بھر تک جب وہ باہر نظر نہ آیا تو کچھ دوست خیر خیریت پوچھنے گھر چلے آئے کسی نے بتایا کہ رکاسی بند ہو چکا ہے اور کورٹ میں ایک زمانے سے عمارت کے مالک اور رکاسی دبار، کے منتظین کے درمیان جو قصہ تھا وہ مالک عمارت کے حق میں فیصلہ ہو چکا ہے۔ یہ خبر آفتاب احمد کے لیے کوئی معمولی خبر نہیں تھی۔ تیس سال کے کسی ایسے ساتھی کی موت جو زندگی کا بوجھ اٹھانے میں برابر کا حصہ ادا کر رہا ہو اور خوشیوں اور مسرتوں کے حصول میں بھی کوئی معمولی سا غم نہ تھا۔ ہاتھ تھکاتے کیسے لے جسے اس نے بکارا رکاسی رکاسی، لیکن رکاسی اس کی راہ تک کر مر گئی تھی۔ اس نے دبی زبان سے کہا، ”اب کیا ہوگا یا ر“ اس کے دوست نے آفتاب احمد کی بہت دیر سے آتی ہوئی آواز سُن لی۔

اس نے انکشات کیا کہ رکاسی پھر سے کھٹنے والی ہے۔ دوسرے لوگ جو اس عمارت کو کرائے پر لے رہے ہیں وہ رکاسی کے نام کی ”رائیٹی“ ادا کر کے پھر بارہ اور رستوراں بھی

کھولنے والے ہیں اور عام خیال یہ بھی ہے کہ رکاسی اس بار بڑی سچ دھج سے کھلے گی۔

دوست جہانگیر کو آفتاب احمد نے گھڑی دیکھ کر اپنی ماں کو دوا دی اور ادھر ادھر کی باتیں کر کے — اسے بہلانا چاہا۔ لیکن جب ماں نے کراہتے ہوئے اس سے پوچھا، ”کیوں آنے لگے تو تو کچھ ادا اس ادا اس سے بیٹا، میری دیکھوئی کرتے ہنستا ہے تو ہنسنی ترے ہونٹوں پر کھلتی نہیں ہے۔ میں اچھی ہو جاؤں گی، پگلے“ تو آفتاب احمد اٹھتے ہوئے آتسو چھپا کر حبیب اپنی ماں کے بستر کے پاس سے اٹھ آیا تو وہ اس کو یہ بھی نہ بتا سکا، ”ماں، رکاسی سر چمکی ہے اور میں اسے آخری بار دیکھ لیتی ہوں۔“

آفتاب احمد نے آج وقت سے پہلے ہی بوتل کھول کر حبیب دسکی گلاس میں انڈیلی تو ایک آتسو بھی اس میں بنا ملا۔

ماں کی حالت دن بدن خراب ہوتی گئی۔ اس سے جو کچھ بن پڑا کیا۔ اپنی جانب سے کوئی کسر اٹھانہ لکھی۔ دو ماہ کی طویل علالت کے بعد اس کی ماں کے پاس سوائے سانس کچھ اور باقی نہ تھا اسی اثنا وہیں آفتاب احمد نے سنا کہ رکاسی پھر کھل گئی ہے۔ اس بار تو اس کی سچ دھج نرالی ہے، اس کا روپ رنگ انوکھا ہے اس کی جمال آرائی اور حشر سامانی دیدنی ہے۔ اس خبر نے بھی کچھ عجیب سی کیفیت آفتاب احمد پر طاری کر دی اس نے رکاسی کی زندگی کی خبر سنی تو اس وقت سنی جب کہ اس کی ماں آخری سانس لے رہی تھی۔ وہ فیصلہ نہ کر سکا کہ غم اور خوشی کی اس ٹی جلی سرحد پر وہ چھپے ہوئے آنسوؤں کا سارہ دے یا پھپھی ہوئی مسکراہٹ بآخو اس کی ماں مر گئی آفتاب احمد نے بڑے تحمل سے اس کو دفن یا ختم قرآن کے لیے حافظ مقرر کیے اور گھر لوٹ کر ماں کے خالی بستر پر اس کے تکیوں میں منہ چھپا کر لیٹا رہا۔ پھر بہت ہی دل دہی سے اس کی قبر اپنی نگرانی میں پختہ بنوائی۔

آج ماں گھر میں نہ تھی تو جیسے ادا سیاں سارے میں پڑاؤ ڈال چکی تھیں۔ وہی کتب خانہ، وہی کتابیں، وہی درد و دوار، وہی اس کا کردہ، وہی پھت، وہی انگلی۔ سب چیزیں جیوں کی تیوں تھیں، صرف ماں کا بستر خالی تھا تو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ہر شے میں کچھ کمی ہو گئی ہے ادا سیاں گھر میں کچھ اس طرح آئی تھیں کہ صحن کی نرم دھوپ پر بھی یرقان زدہ مریض کی چادر کا گمان ہوتا تھا۔ ایک عمر کی رفیق اپنی تنہائیوں کو اس غمزدہ فضا میں اپنے سینے میں چھپائے ہوئے وہ کئی بار رکھ سہی کو یاد کرتا۔ وہ سہی سے بھرے ہوئے جام میں اپنے چہرے کا عکس دیکھ کر اسے اپنی ہستی بڑی کھوکھلی سی معلوم ہوئی۔

اپنے وجود کے بارے میں اس کے اپنے ذہن میں کئی سوال ابھرنے لگتے۔ زندگی کیا ہے، کیوں ہے اور اس طول سفر میں میہری اپنی کوئی منزل بھی ہے یا سفر ہی سب کچھ ہے۔ اس نے اس سوال کا جواب رکاسی سے پوچھنا چاہا، رکاسی جو اس کی تیس سالہ تنہائی پسند زندگی کی راز داں ہے۔ مہینوں بعد رکاسی کی فضاؤں میں سانس لینے کے تصور ہی سے اس نے محسوس کیا جیسے کوئی اسے تسلی دے رہا ہو، کوئی اس کے زخموں پر پچھائے رکھ رہا ہو۔

وہ شام ہوتے ہوتے رکاسی پہنچ گیا، خشک حوض جو اس کی زندگی کی طرح اب آنا بدل گیا تھا کہ پہچانا نہیں جاتا تھا۔ لوہے کے خاردار تار ٹوٹ کر نرم اور ٹھنڈی ہریالی بن گئے تھے۔ بالائی حصے پر پہنچ کر وہ ایک ایک گوشے میں اس رکاسی کو ڈھونڈتا پھر اس کی اندرونی کیفیت کا بیرونی عکس رہی تھی۔ لوگ اس کو سرد کے لیے لیے سایوں میں ہریالی پر بکھری ہوئی کرسیوں پر خشکیاں کرتے نظر آتے دوسری جانب کا وسیع بالائی حصہ جو خود روگھاس کے بکھرے ہوئے برے دھواں

کے باعث ایک ایسا قدرتی منظر پیش کرتا تھا جس کو انسانی ہاتھوں نے سمجھا نہیں ہو سکتا۔
 ڈولفین کا رز، اور ریڈ کارنر، میں بدل گیا تھا۔ اب نہ وہ ماحول تھا جہاں اپنی
 تنہائیوں کی محفل سجانے کا امکان نکل آتا۔ اب نہ بارٹھ میں وہ سسکتی ہوئی ہوائیں
 تھیں جو آدمی کے سینے میں دھیمی دھیمی آہنچ بھی لگاتی تھیں۔ اب بجلی کے گولے اُس
 طرح نہ جلتے تھے کہ انسانی دکھ درد کو اپنی کم کم روشنی چھپا لینا چاہتے ہوں۔ اب
 رکاسی کی فضاؤں میں نہ وہ بولتی ہوئی کسی خاموشی تھی نہ وہ آباد ویرانی تھی جس سے
 آفتاب احمد درد رعبے مانوس تھا۔ وہ قالین پر بکھرے ہوئے بچے رنگین پھولوں کو
 روند کر جیب ہال کے بچو بیچ پوچھ گیا تو بالکل مبہوت سا اس طرح کھڑا کھڑا رہ گیا
 جیسے اپنی اس شریک حیات کو جو برقعے میں بھی بجاتی اور شرابی تھی، ”ڈانس ہال“
 میں نیم برہنہ کسی کے ساتھ رقص کرتی ہوئی دیکھ رہا ہو۔ اس نے بلیکس جھپکائیں، سینک
 اتار کر آنکھیں ملیں، پھر شیشے صاف کر کے سینک چڑھائی۔ لیکن نہ رکاسی نے اسے پہچانا نہ
 اس نے رکاسی کو۔ دہان تو ایک پہرہ بھی نہ تھا۔ وہ چپ۔ چاپ ہال کے باہر نکل گیا۔
 اس نے اچھٹی ہوئی نگاہیں، سرد کے لیے سایوں کے نیچے بھی ہوئی ہریالی پر ڈالی،
 پھر اسی سمت بڑھ کر ایک ایسے کچھ میں بیٹھ رہا جہاں کم سے کم نظریں اسے دیکھ پاتیں۔
 دیر تک بیٹھا وہ دھمکی پیتا رہا۔ اس کی آنکھیں رکاسی کو تلاش کرتی رہیں، اس کا جی
 چاہا وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر بارے رکاسی تم ڈانس ہال سے باہر نکل آؤ اور مجھے سینے سے
 لگا لو۔ میں تمہاری صورت کے لیے ترس گیا ہوں۔ میں وہ سب کچھ زندگی کے دست برد
 سے بچ کر آج بھی تمہارے لیے یہاں لے آیا ہوں، رکاسی، جو ہم دونوں کو شہرک تھا، لیکن تم
 بدل گئی ہو، تم جو میری تنہائیوں کی آغوش تھیں، تم جو میرے دکھ درد کا رشتہ تھیں۔

دیوانوں کی طرح چپے چپے کو تکتا ہوا گوشے گوشے میں کچھ ڈھونڈھتا ہوا وہ جب سڑھیا
 اترنے لگا تو اپنا بھلیگا ہوا رومال جیب میں رکھتے ہوئے اس نے سوچا — ماں مر گئی تھی
 زندگی سے کوئی شے کم ہو گئی تھی، لیکن رکاسی تو زندہ ہے۔۔۔۔ پھر وہ یہ چاہتی کیوں نہیں جاتی
 پھاٹک تک آکر اس نے ایک نگہ پھر رکاسی پر ڈالی۔ رکاسی سے گریں پھوٹ رہی تھیں۔ اس
 نے بہ آواز بلند پوچھا، میں اب اپنی شامیں، رے کر کہاں جاؤں؟ رکاسی، تم ہی بتاؤ؟ لیکن
 کچھ جواب نہ پایا کہ اپنی بقیہ زندگی کی طویل شام سینے سے لگائے وہ باہر نکل گیا۔

ماہنامہ کتاب کی

یادگار اشاعتیں

دہمیشہ زندہ رہیں گے

● افسانہ نمبر قیمت = ۶/ اس افسانے، ۲ ناولٹ، ۲ ڈرامے، ۴۰ مضامین اور ۲ فکر انگیز سمپوزیم، ۳۰ تصاویر صفحات ۴۳۴

● سالنامہ ۱۹۹۶ء قیمت = ۶/ اس یادگار نمبر میں ہندستان اور پاکستان کے صف اول کے فنکاروں کی تخلیقات کے علاوہ جدید شاعری پر ایک پرمغز سمپوزیم شامل ہے جس میں ہندوپاک کے سارے ہی اہم نقادوں اور شاعروں نے حصہ لیا ہے۔

● منتخب افسانہ نمبر قیمت = ۱۵ روپے۔ اردو افسانہ نگاروں نے ۱۹۶۲ء میں کم و بیش ۲ ہزار افسانے تخلیق کیے جن میں سے رام لعل اور عابد سہیل نے ۲۷ افسانے منتخب کیے۔

● نئی ہندی کہانی نمبر قیمت = ۱/ اردو افسانے نے ہندی افسانے کو کس حد تک متاثر کیا ہے۔ اس کا اندازہ آپ اس نمبر سے لگا سکتے ہیں۔

● علی عباس حسینی نمبر قیمت = ۱/۲ اس نمبر میں حسینی صاحب کی بہترین کہانیوں کے علاوہ ان کے فن اور زندگی پر متعدد مضامین شامل ہیں۔

● مراٹھی کہانی نمبر قیمت = اس نمبر میں مراٹھی کی ۲ نمایندہ کہانیوں کے علاوہ مراٹھی ادب پر ہم فکر انگیز مضامین شامل ہیں۔ مرقبہ: نو رپکار کے اس کارنامہ کو علمی اڈا دلی حلقوں میں بے حد سراہا گیا ہے۔

ماہنامہ کتاب کی پور مارکیٹ۔ کھنوی